تنزیلہ ریاض

تنزیلہ ریاض

مرگ مرگ

ڈرامہ ختم ہوتے ہی پورا ہال تالیوں کی آواز سے گونج اٹھا تھا۔
پچھلی نشستوں کے عین اوپر نصب بڑے بڑے بلب روشن ہونا شروع ہوگئے۔ تاریکی بہت سرعت سے رو[illegible] کا لبادہ اوڑھ کر اجالے کا روپ دھارنے لگی تھی۔ لمحہ[illegible] میں تمام ہال روشنی کی تیز پھوار سے بھیگ چکا تھا۔ اسٹیج[illegible]

بھاری سرخ پردہ تیزی سے برابر ہونے لگا۔ تالیوں کی گونج دھیرے دھیرے دم توڑنے لگی۔ لوگ ایک کے بعد ایک گرتے پڑتے، ہنستے گاتے ایک دوسرے کو دھکا دیتے اس دروازے کی سمت بڑھنے لگے، جہاں Exit لکھا تھا۔ ہال آہستہ آہستہ خالی ہونے لگا اور ایسے میں دو بھوری بے حس آنکھیں ابھی بھی ٹکٹکی باندھے سامنے کی جانب دیکھنے میں مگن تھیں۔ ان آنکھوں میں نیلگوں شعلوں کی لپک دور سے بھی محسوس کی جاسکتی تھی۔

روشنیاں جل بجھ چکی تھیں۔ ہال خالی ہو چکا تھا۔ پردہ برابر ہو چکا تھا اور ڈرامہ ختم ہو چکا تھا۔ یہ کہانی وہاں سے شروع ہوئی جہاں ڈرامہ ختم ہوا تھا۔

✿ ✿ ✿

"اب اٹھ جائیں نا۔ آٹھ بج رہے ہیں۔" اس کی سماعتوں نے صبح صبح اسی مخصوص نرم گرم سی آواز کو سنا۔ جس کا وہ گزشتہ کئی سالوں سے عادی ہو چکا تھا۔ حالانکہ

اسے یہ آواز و انداز کچھ خاص پسند نہیں تھے۔
"اب اٹھ جائیں۔" اب کے دوسری بار پکارا گیا۔ اس بار آواز میں لاڈ کی شیرینی پہلے سے زیادہ تھی۔ اس کی ماں اس کے باپ کو اپنے مخصوص انداز میں جگا رہی تھی۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ یہ بے سود ہے مگر پھر بھی وہ اپنی عادت سے مجبور تھی۔

اسے اپنی ماں کی اس عادت سے بہت چڑ ہوتی تھی۔ اسے کبھی یہ اچھا نہیں لگا تھا کہ اس کی ماں اس کے باپ کے بے جا لاڈ اٹھائے۔ وہ اپنے باپ کو کسی قسم کی رعایت کا مستحق نہیں سمجھتا تھا۔

"ایک ایسا شخص جو ساری رات گھر سے باہر رہے۔ جو گھر میں صرف سونے کے لیے آئے اور جو عیاشی کے نام پر اتنے روپے لٹائے۔ آپ اس شخص سے اتنی محبت کیسے کر سکتی ہیں؟"

وہ برملا اپنی ماں کے سامنے کہا کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کا باپ ان لوگوں میں سے ہے جو خود کو اور خود سے وابستہ لوگوں کو محض تنگ کرنے کے لیے ایک الگ ڈھب کی زندگی گزارتے ہیں۔ جب سارا زمانہ سوتا تھا تو اس کا باپ جاگتا تھا اور جب سارا زمانہ جاگنے کی تیاری کرتا تھا تو وہ سونے کے لیے لیٹ جاتا تھا۔

"خدارا! اب اٹھ بھی جائیں۔" اس کی ماں کی پچکارتی ہوئی آواز پھر سنائی دی۔ اب کی بار اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ اس کی ماں کی آواز میں واضح تبدیلی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ جانتا تھا کہ اس کی ماں کی آواز میں کیا تبدیلی آ چکی ہے۔ مگر وہ کچھ کہنا نہیں چاہتا تھا۔ یا شاید وہ کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں رہا تھا۔ وہ دوبارہ زمین کی جانب دیکھنے لگا۔ کیوں اس کے اندر سامنے دیکھنے کا شوق تھا نہ ہمت۔ وہ اپنی توجہ زمین پر بچھے گھاس کے مخملیں فرش اور اس فرش پر دھرے اپنے پاؤں کی جانب مبذول کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

رات کسی پہر ہلکی بارش ہوئی تھی، جس کی وجہ سے گھاس کا قالین نم تھا۔ وہ یہاں سے اٹھنا نہیں چاہتا تھا۔ کچھ دیر پہلے ہی اس نے اپنے سلیپرز پاؤں سے علیحدہ کیے تھے۔ جو اس کے سامنے ہی پڑے تھے جب کہ وہ خود ٹانگیں پیٹ سے لگائے ان کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنائے اس طرح بیٹھا تھا جیسے جمعدارنیاں کام کاج سے فارغ ہونے کے بعد بیٹھتی ہیں۔ اسے جس شخص کی وجہ سے اس طرح بیٹھنا پڑ رہا تھا وہ عین اس کے سامنے کسی نشئی کی طرح بے سدھ لیٹا تھا۔ اس کے دل میں ایک بار پھر بیزاری کی لہر نے سر اٹھایا۔

"یہ اٹھ کیوں نہیں جاتے؟" اس نے زمین کی جانب دیکھتے ہوئے گہری سانس بھر کر سوچا۔ وہ بخوبی جانتا تھا کہ کیا چیز اس کے باپ کو اس طرح ہوش و حواس سے بیگانہ کیے ہوئے ہے مگر وہ اس چیز کو اہمیت دینے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے زندگی میں اپنے سوا کبھی کسی کو اہمیت نہیں دی تھی۔

"یہ مجھے کس بات کی سزا دے رہے ہیں؟" اس نے کن انکھیوں سے اپنے باپ کی چارپائی کی جانب دیکھ کر سوچا۔ اس کی ماں بھی وہیں موجود تھی۔ ان دونوں کو گرمیوں میں کھلے آسمان تلے سونے کی عادت تھی جب کہ اس کا یہ حال تھا کہ وہ ایک لمحہ بھی اس طرح نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ واش روم میں بھی اے سی لگوا لیتا۔ اس کی سیاہ قمیص پشت سے پسینے کے باعث بھیگ چکی تھی۔ پسینے کی ایک دھار اس کے بالوں اور کنپٹی سے ہوتی ہوئی گردن تک آ رہی تھی۔ اس کے پاؤں پر مٹی اور سیاہ شلوار پر گھاس کی سبز پتیاں چپک گئی تھیں۔ اسے ان سب چیزوں سے وحشت محسوس ہو رہی تھی اور سب سے بڑا بورد سر فی الحال اس کی ماں کی لاڈ بھری آواز تھی۔ جس میں لاڈ کے علاوہ بھی کوئی چیز تھی۔

"مجھے کیوں ستاتے ہیں آپ؟" اس کی ماں نے شکوہ کرنے کے ساتھ شاید اب اس کے باپ کے بالوں میں انگلیاں چلائی تھیں۔ یا شاید اس کے کندھے کو ہلایا تھا۔ وہ اب ان دونوں کی جانب نہیں دیکھ رہا تھا۔

"آپ دونوں مل کر مجھے کیوں ستا رہے ہیں؟" اس نے دل ہی دل میں ناگواری سے سوچا۔ جھنجلاہٹ اس پر اس لیے بھی سوار تھی کہ اس کے اندازے کے مطابق اس کے ماں باپ اپنے بیڈ روم میں سوئے تھے اور اب وہ لان میں تھے۔

"یہ لاؤنج میں بھی تو آرام فرما سکتے ہیں۔" وہ ایک بار پھر بڑبڑایا۔

اس کے سامنے پڑے سلیپرز اسے منہ چڑاتے محسوس ہو رہے تھے۔ بارہ سو کے یہ سلیپرز اس نے مری سے خریدے تھے۔ ان سلیپرز میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ لیدر کے Patches والے یہ سلیپرز اسے پہلی نظر میں بہت خاص لگے تھے۔ اس نے ہمیشہ کی طرح سوچے سمجھے بغیر انہیں خرید لیا تھا۔ اسے ہر کام اسی طرح بغیر سوچے سمجھے کرنے کی عادت تھی۔

"یہ بارہ سو کے سلیپرز ہیں...؟ غضب خدا کا... اتنے مہنگے سلیپرز... تمہیں ان میں روٹی ڈال کر کھانی ہے۔ اتنے مہنگے سلیپرز انسان پاؤں میں نہ ڈالے بس شیشے کی الماری میں سجا کر رکھے اور آتے جاتے دیکھا کرے۔ تمہیں سلیپرز چاہیے تھے تو تم مجھے کہتے۔ میں تمہیں لا دیتی۔ صدر میں اسی قسم کے سلیپرز نوے روپے کے مل رہے ہیں۔"

اس کی ماں نے یہ سلیپرز دیکھ کر حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"آپ جانتی ہیں اسٹینڈرڈ کس چڑیا کا نام ہے۔ وہ نوے روپے کے سلیپرز جو مستو بھنگی پہنتا ہے، وہ میں پہنوں گا... او نو... ایسی چیزیں آپ کو اور آپ کے ہسبینڈ کو مبارک ہوں۔"

وہ چڑ کر بولا تھا۔ اسے اپنی ماں کی طرف داری اچھی نہیں لگتی تھی۔ اس کا باپ عیاشی کے نام پر ڈھیروں روپے خرچ کرتا تھا اور اس کی ماں کوئی استفسار نہیں کرتی تھی جبکہ اس کے ہزار دو ہزار خرچ لینے پر وہ بے تحاشا سوالات کرتی۔

"اس میں میرا کیا قصور ہے۔ آپ لوگوں نے مجھے اسی طرح Brought up (پرورش) کیا ہے۔ اگر آپ مجھے اس طرح پرورش نہ کرتے تو میں اس طرح کا نہ ہوتا، اس لیے آپ مجھے اس معاملے میں قصوروار مت ٹھہرایا کریں۔"

وہ باپ کے رویے سے عاجز آ کر ماں کو بے نقط سناتا۔ ان سلیپرز کے لیے بھی اس نے ہنگامہ برپا کر دیا تھا اور اب یہی سلیپرز اس کے سامنے بے بس پڑے تھے اور اسے اتنے برے لگ رہے تھے کہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ انہیں دور پھینک دے۔ وہ اپنے باپ کو مادی اشیاء کے ساتھ تولتا تھا۔ اس کے لیے سامنے پڑا باپ اور سلیپرز ایک برابر تھے۔ وہ ان دونوں کی جانب نہیں دیکھنا چاہتا تھا لیکن نگاہیں بھٹک بھٹک کر اسی سمت چلی جاتیں۔ وہ اس ساری صورت حال سے زچ ہوا جا رہا تھا۔ وہ کچھ دیر کے لیے اس منظر سے ہٹنا چاہتا تھا مگر اسے یہ ممکن نہیں لگ رہا تھا۔ دھوپ کی شدت میں تیزی آ رہی تھی۔ سورج نے تلواروں جیسی کرنیں نیاموں سے نکال کر گویا حملہ سا کر دیا تھا۔ اس کے باپ کی چارپائی کے گرد اسٹینڈ فین پوری رفتار سے چل رہا تھا۔

پنکھے کی گھرر گھرر اس کے سر پر ہتھوڑے کی ضرب کی طرح لگ رہی تھی۔ فضا میں ہوا کی ذرا سی بھی رمق نہیں تھی، جس کی وجہ سے کھلی ہوا میں بھی گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔

"خدا کے لیے اب اٹھ جائیں۔ میرے ساتھ یہ سب مت کریں۔" اس کی ماں کی آواز پر سسکیاں غالب آ رہی تھیں۔ اس کا باپ اپنی جگہ سے نہیں ہلا تھا مگر وہ خود جو اپنے باپ کے بستر سے دس قدم کے فاصلے پر بیٹھا تھا یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کے ساتھ بیٹھے صفدر نے سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا پھر گہرا سانس بھر کر دوبارہ نظریں جھکا لیں۔ صفدر کی آنکھیں بے حد سرخ ہو رہی تھیں۔ اس کی سرخ آنکھوں سے نظریں چرا کر وہ سلیپرز پہننے لگا۔ صفدر کے ساتھ عمر ربیط اور شاہ نواز اسی پوزیشن میں بیٹھے تھے۔ اسے اکبر

کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ سلیپرز پہن کر وہ بڑے بڑے قدم اٹھاتا سرخ پتھروں کی روش پر آ گیا۔ روش کی دوسری جانب گھاس کا ایک "نسبتاً" چھوٹا قطعہ تھا۔ رحیم اور اکبر شامیانہ لگانے میں مصروف تھے۔ ان دونوں کے وجود سے عجیب طرح کا اضطراب ٹپک رہا تھا۔ ایک جانب انکل صدیق ہاتھ باندھے ماموں عنایت اللہ کے پاس کھڑے تھے۔ انکل صدیق جنہیں صرف وہی ان کے اصلی نام سے پکارتا تھا، نجانے کب آ گئے تھے۔

"آج واقعی ہم سب کا بہت بڑا نقصان ہوا ہے۔" انہوں نے اسے گلے لگا کر کہا تھا۔ ان سب کو نظر انداز کر کے وہ گیراج کی سمت بڑھا' جہاں اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ سلور گرے سوک اس نے کچھ عرصہ پہلے ہی لیز کروائی تھی۔ اس کے عقب میں اس کی ماں کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔

"میرا بچہ۔" اسے یکدم کسی نے گلے لگایا اور اس کی پشت کو سہلایا تھا۔

"انا للہ وانا الیہ راجعون۔" کوئی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے اسے اس کے باپ کی موت کا دلاسا دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

شاید 80ء کی بات ہے کہ اس پر لاہور جانے کا جنون سا طاری ہو گیا۔ تب لاہور واقعی "لہور" ہوا کرتا تھا۔ لہوریوں کو دبئی' سعودیہ جانے اور ریالوں اور درہموں کا نیا نیا چسکا لگا تھا۔ سو طریق زندگی تیزی سے تبدیل ہو رہا تھا۔ ڈیفنس اور گلبرگ جیسی ہاؤسنگ سوسائٹیوں کی رونمائی ہو چکی تھی جبکہ ماڈل ٹاؤن' جوہر ٹاؤن اور کینال ویو جیسی سوسائٹیاں اور تکمیل کے مرحلے سے گزرنے کے لیے حجلۂ عروسی میں پہنچنے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ یہ سب آپس میں اگرچہ دیورانیاں' جٹھانیاں تھیں مگر ان کی سوکنوں۔ یعنی کرشن نگر' دھرم پورہ' گڑھی شاہو اور اندرون شہر کے لہوریوں سے آباد وہ تمام علاقے جن کے باسی دھڑلے سے "ر" کو "ڑ" بولتے تھے کا پلڑا زیادہ بھاری تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شہر کی سڑکوں پر گاڑیوں کے ساتھ ساتھ تانگے اور رنگین بگھیاں کثرت سے نظر آتی تھیں۔ جبکہ انار کلی بازار میں چست برقعوں میں ملبوس سرگشت کرتی خواتین کی تعداد جدید کا ملبوسات والی خواتین سے زیادہ ہوا کرتی تھی۔ ایسے میں جب اس پر لاہور جانے کا جنون طاری ہوا تو اماں جی نے چولہے کے سامنے بیٹھے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ حیرانی سے تقریباً "نوٹ ہوتی ہوئی" بھابھی تیزی سے بھینس کا دودھ دوہنے لگی اور اباجی سنے دیکھے دیے کر اس کے اس جنونی غبارے سے ہوا نکل رہی جاہی مگر وہ بھی اباجی کا ہی بیٹا تھا۔ سو اڑیل گھوڑے کی طرح ایک ٹانگ پر کھڑا ہو کر ہنہنانے لگا لیکن اباجی نے صاف انکار کر دیا۔

"بیٹے! پردیس بھیجنے کے لیے پیدا نہیں کیا تھا میں نے۔" انہوں نے گرجتے ہوئے صاف انکار کر دیا تھا۔ وہ ان کے سخت لہجے سے خائف ہو کر خاموش ہو گیا مگر وہ کیڑے ابھی اس کی زنبیل میں تھے۔ سو وہ آزمانے شروع کر دیے۔ ایک دن گزرا' دو دن گزرے' تیسرا بھی گزر گیا۔ چوتھے دن اماں جی سے صبر نہ ہو سکا۔

"میں نے کہا جی' وہ تین دن سے کچھ نہیں کھا رہا۔" وہ اباجی کی چارپائی کی پائنتی پر بیٹھ کر ازحد پریشانی سے بولیں تھیں۔ اباجی ماچس کی تیلی پر روئی لگائے اسے تیل میں بھگو کر کان صاف کرنے میں مگن تھے۔ اپنے ہی دھیان میں بولے۔

"اسے جو کے آٹے اور گڑ کی میٹھی چوری بنا کر دے۔ دیسی گھی بنا کر (دل کھول کر) ڈالنا۔ دیکھنا مزے سے کھانے لگے گا۔ گرمی ہو گئی ہے۔ چوری دیکھے گا تو خوشی سے کھا لے گا۔"

اماں جی نے اس آزمودہ نسخے پر سر تو ہلایا مگر دل سے اتفاق نہیں کیا تھا۔ گرمی ہوتی تو لسی کے گلاس سے دور ہو جاتی۔ ان کا دل تو اس بات پر افسردہ تھا کہ صبح ان کے ہونہار سپوت نے لسی کا ایک ہی گلاس پیا تھا اور دوسرا واپس کر دیا تھا۔ ان کا ممتا بھرا معصوم دل ڈیڑھ لیٹر کی پیپسی جتنے بڑے گلاس کو اہمیت دینے کو تیار نہیں تھا۔

"اگر چوری سے گرمی دور نہ ہوئی؟" انہوں نے ایک اور سوال کیا۔ کان کھجاتے اباجی جوش میں آ کر زیادہ زور سے تیلی گھما بیٹھے تھے۔ سو جھنجلا کر اماں جی پر چڑھ دوڑے۔

"اوئے نہ دور ہوئی تو مجھے باندھ کر دے دینا' قصائی کو دے آؤں گا' حلال کر دے گا وہ' ہمیں کس چیز کی کمی ہے اور رولا ڈال کا مجھے۔"

"ہے ہے... کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ... یہ عمر

ہے آپ کی... گھر میں بہو ہے' جوان بیٹے ہیں اور آپ کو ایسی بری سوجھ رہی ہے۔"

وہ انگلی منہ میں داب کر لال سرخ ہوتے ہوئے بولی تھیں۔ اباجی نے ناک چڑھا کر ان کی اس ادا کو دیکھا۔ یہ طعنہ تو ان کی زوجہ محترمہ تب سے دیتی آ رہی تھیں' جب ان کے بیٹوں کو "جوان" کا مطلب بھی ٹھیک سے نہیں پتا تھا اور محترمہ بہو ابھی اس دنیا میں تشریف نہیں لائی تھیں۔

"تنیا کُکڑ (مرغا) لانے کے لیے بھی عمر کا دھیان رکھنا پڑتا ہے کیا... بتاؤ' ایسا کیا کہہ دیا میں نے... اونہہ جاہل عورت۔"

وہ حد درجہ چڑ کر بولے۔ پرائمری پاس ہونے کا بہت زعم تھا انہیں۔ اماں جی کا دل چاہا اپنا سر پیٹ لیں۔ ان کا مرغا واقعی کچھ دنوں سے سست ہو رہا تھا مگر فی الوقت وہ بیٹے کا رونا رو رہی تھیں۔

"میں ککڑ کی نہیں' آپ کے پتر کی بات کر رہی ہوں جو چار دن سے منہ سجا کر پڑا ہے۔ پروا ہے کوئی آپ کو... اونہہ۔"

وہ تعلیم کا طعنہ نہیں دے سکتی تھیں' سو فقط "اونہہ" کہہ کر واک آؤٹ کر گئیں مگر اباجی کو جذباتی کر گئیں۔ اپنے چھوٹے بیٹے سے بہت محبت تھی انہیں۔ اللہ نے سات اولادیں دی تھیں جن میں سے پہلے اور آخری کو چھوڑ کر دو بیٹیاں اور تین بیٹے پیدا ہوئے بعد دیگرے اللہ کو پیارے ہوتے گئے۔ چھوٹا ذرا سا ناتواں تھا' سو صحت کے معاملے میں باپ اور بھائی سے دبتا تھا پھر اباجی نے اسے اسکول میں ڈال دیا۔ اباجی کا خیال تھا' یہ ان کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ اسکول کی تعلیم نے اسے صحت کے معاملے میں بالکل ہی ماٹھا کر دیا۔ اس کے اندر مردوں والے کوئی شوق ہی نہ پیدا ہو سکے۔ عجیب زنانہ قسم کے شوق تھے اس کے۔ موٹی موٹی کتابیں پڑھتا رہتا۔ پرائمری تو اپنے گاؤں سے پاس کی پھر قصبے کے اسکول سے میٹرک پاس کیا اور دو سال بعد پرائیویٹ بارہ جماعتیں بھی پاس کر لیں۔ بارہ جماعتوں کا یہی غرور اب سر چڑھ کر بول رہا تھا۔

بڑے والے کو اباجی نے بیس سال کی عمر میں بیاہ دیا مگر چھوٹا تو پیروں پر پانی نہیں پڑنے دیتا تھا۔ ان کا ارادہ تھا کہ اس کی شادی کر کے اس ذمہ داری سے بھی فراغت حاصل کر لیں مگر وہ لاہور جا کر مزید پڑھنا چاہتا تھا۔ انہیں روپے کی کمی نہیں تھی۔ زمین اگرچہ ان کی زیادہ نہیں تھی مگر قسمت کے دھنی تھے جو کاشت کرتے تھے' وہ سونا بن کر نکلتا تھا' اسی لیے وہ بیٹے کی مزید تعلیم کے خلاف تھے کہ انہیں افسری تو کروانی نہیں تھی اور پھر جیسی سوکھی سڑی ان کے بیٹے کی صحت تھی' وہ ہمہ وقت انہیں احساس دلاتی تھی کہ مزید تعلیم اس کے لیے مہلک ثابت ہو گی جبکہ وہ ضد لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ انہوں نے اس سے تفصیلی بات چیت کا ارادہ کیا۔ اماں جی کو ایک طعنے سے ناک آؤٹ کر کے وہ غصے میں صحن میں آ گئے۔ ان کا لاڈلا اپنی بان والی چارپائی کی پائنتی کی دری کسنے میں مگن تھا۔ چارپائی کے فریم پر ایک ٹانگ رکھے وہ دری کو اوپر نیچے' نیچے اوپر ڈھیلی کے بیچ دیتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ چولہے کے پاس پڑی چوکی پر جا کر بیٹھ گئے۔ دائیں سمت میں ان کا حقہ اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ جلوہ افروز تھا۔ صحن میں بھوری' سفید' چتری مٹری مرغیاں اور ان کے چوزے چہل قدمی میں مصروف تھے۔

"اوئے تو لاہور جا کر کرے گا کیا؟" اس کی پشت کو گھورتے ہوئے انہوں نے سوال داغا تھا۔

"غلیل بناؤں گا اور چڑیاں ماروں گا۔" چارپائی کو کستے ہاتھ بس لمحہ بھر کے لیے رکے تھے اور پھر چٹختی ہوئی آواز آئی تھی۔ اباجی نے بے یقینی سے اس کی جانب دیکھا۔ گویا فیصلہ کر پا رہے ہوں کہ وہ سنجیدہ ہے یا مذاق کر رہا ہے۔

"کھوتا... نہیں مارنے۔ چڑیاں مارنے کے لیے پردیس جانے کی کیا ضرورت ہے۔"

"یہاں آپ مجھے آنکھ نہیں مارنے دیتے' چڑیاں خاک مارنے دیں گے۔"

وہ منہ بنا کر دھیمی آواز میں بولا۔ دل ہی دل میں ان سے ڈرتا بھی تھا اور خواہش تھی کہ آواز ان تک پہنچ بھی جائے۔ رسیاں کسنے کے ساتھ وہ منتظر سماعتیں لیے اباجان کی جانب سے کسی کرارے جواب کی توقع کر رہا تھا مگر کافی دیر تک کچھ سننے کو نہیں ملا۔ اس نے ذرا سی گردن موڑ کر کن اکھیوں سے ان کی جانب دیکھا اور جل کر خاک ہو گیا۔ وہ مٹی کے چولہے میں جلتے ایندھن سے حقے کی چلم کا پیٹ بھرنے میں مصروف تھے۔ چلم بھرنے کے بعد انہوں نے اسے بہت محبت سے حقے کی گردن پر سجانا شروع کر دیا۔

پھر وہ اپنا کام مکمل کر کے دوسری طرف پڑے تخت پر جا

بیٹھے ——— حقہ گڑگڑاتے ہوئے سرخ اینٹوں کے فرش پر دانہ چگتی مرغیوں کو دیکھنے لگے جیسے واقعی وہ مرغیاں نہ ہوں بلکہ دربار میں رقص کرتی حسین و جمیل کنیزیں ہوں۔

جھکتے کھلتے ہوئے اس نے چارپائی کس کر پچھلی دیوار کے ساتھ کھڑی کردی اور خود ہینڈ پمپ چلا کر ہاتھ منہ دھونے لگا۔ پھر تار پر لٹکتے تولیے سے منہ ہاتھ صاف کرنے لگا۔

"یار! میں تیری اس نزاکت سے بہت تنگ ہوں۔ رتی کو ہاتھ لگانے سے میلا ہوگیا تھا تو جو عورتوں کی طرح ہاتھ منہ دھونے چل دیا۔"

اس نے تولیا رسی پر پھینکا اور آگ بگولا ہوتا ان کے پاس تخت پر آبیٹھا۔

"مجھے ایک بات بتائیں ابا جی! میں آپ کا بیٹا ہوں یا آپ کے شریکوں کا۔ میری ہر بات میں کیڑے نکالنے لگتے ہیں آپ۔"

وہ تپ کر پوچھ رہا تھا۔ ابا جی نے ایک بار پھر اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا' جب وہ لاجواب ہوتے تھے تو اسی طرح خاموش ہوجایا کرتے تھے مگر ان کی آنکھوں سے شرارت جھلکنے لگتی تھی جو ظاہر کردیا کرتی تھی کہ وہ اب کچھ نہیں بولیں گے۔ وہ ان کی جانب دیکھتا رہا جبکہ وہ مزے سے حقہ گڑگڑاتے رہے۔

"تو نے کبھی حقہ پیا ہے؟" اسے اپنی جانب دیکھتا پاکر انہوں نے پوچھا تھا۔

"جی نہیں۔"

"اسی لیے تیرا مزاج اتنا کڑوا ہے۔" انہوں نے فوراً رائے دی۔

"آپ کے مزاج سے بھی شہد نہیں ٹپکتا۔ مجھ سے زیادہ کڑوا مزاج ہے آپ کا۔" وہ ان ہی کے انداز میں بولا۔ ابا جی کے بازو کے نیچے تکیہ تھا۔ انہوں نے اس کی پوزیشن درست کی پھر ٹانگیں پھیلا کر بولے۔

"اوہ نہیں یار۔ تجھے غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ تیری ماں تو یہی کہتی ہے کہ میں جی آپ کا مزاج تو شہد کے جیسا ہے۔"

وہ اماں جی کے لہجے کی ہوبہو نقل اتارتے ہوئے بولے۔ لفظ "میں جی" پر اسے ہنسی آگئی۔ اماں جی انہیں مخاطب کرنے کے لیے "میں جی" ہی استعمال کرتی تھیں۔

"اماں جی کو غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ ویسے بھی آپ دونوں مسٹر اینڈ مسز "میں جی" ایک دوسرے کی خوبیوں کے بارے میں مشکوک رہتے ہیں۔"

وہ ٹانگیں سمیٹ کر تخت پر بیٹھ گیا تھا۔ ان کے پاؤں اس کی گود میں گھس رہے تھے۔ وہ چونکہ ان سے ناراضی کا اظہار کررہا تھا' سو اس نے ان کے پاؤں کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اگر اسے یہ نہ ظاہر کرنا ہوتا تو وہ فوراً ان کے پاؤں دبانے لگتا۔

"تیری ماں تیری وجہ سے پریشان ہے۔ مجھے تو تیرا کوئی فرق نہیں پڑتا مگر اس کی خاطر پیٹ بھر کر روٹی کھایا کر۔"

وہ دھیرے دھیرے اصل بات کی طرف آرہے تھے۔

"میری ماں آپ کی وجہ سے بھی بہت پریشان ہے۔ مجھے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا مگر ان کی خاطر یہ حقہ نہ پیا کریں آپ۔"

وہ انگلیاں بالوں میں چلانے لگا تھا۔

"یار! اب اس بڈھی کی خاطر حقہ پینا چھوڑ دوں میں۔"

وہ بچوں کی سی معصومیت سے بولے تھے۔ انہیں اپنے حقے سے عشق تھا۔ اس کے لیے ان کی یہ معصوم ادا نئی نہیں تھی۔ اس کا دل چاہا' ان سے لپٹ جائے مگر پھر وہی ناراضی آڑے آگئی۔

"میں بتاؤں اماں جی کو کہ آپ انہیں بڈھی کہہ رہے ہیں؟" وہ مسکراہٹ چھپا کر بولا۔

"ہے پاگل نہ ہو تو۔ اتنی سیانی ہے تیری ماں۔ اسے خود یہ بات پتا ہوگی۔"

وہ سابقہ انداز میں بولے تھے۔ اب کی بار وہ ہنسی چھپا نہیں پایا تھا۔ انہیں اس کو اس طرح ہنستا دیکھ کر کافی طمانیت ہوئی تھی۔

"آپ کی زوجہ محترمہ کو سیانا ہی ہونا چاہیے تھا' ورنہ آپ کا گزارا کیسے ہوتا۔"

محبت سے کہتے ہوئے اس نے ان کے پاؤں دبانا شروع کردیے تھے۔ ابا جی مزید پھیل کر لیٹ گئے۔

"تیری زوجہ بھی سیانی ہوگی۔ نسرین ماشاء اللہ بہت سمجھ دار ہے۔"

وہ اس کی خالہ زاد بہن کا نام لے کر بولے جو اس کی منہ بولی منگیتر تھی یعنی زبانی کلامی۔ سب کا خیال تھا کہ اس کی اور نسرین کی شادی ضرور ہوگی۔ نسرین ان کے خاندان کی واحد لڑکی تھی جو آٹھ جماعتیں پاس تھی جبکہ وہ خود اس

سے دل و جان سے انکاری تھا۔ ابا جی کے منہ سے نام سن کر اس کی ناک پھولنے لگی۔ یہ اس کی ناپسندیدگی کا واضح اظہار تھا۔

"اگر ایسا کچھ ہوا تو پھر میری زوجہ بیوہ ہی ہوگی۔" وہ ناراضی بھرے لہجے میں بولا۔

"یار! تیرا دماغ بہت چڑھا ہے۔ نسرین سے بیاہ نہیں کرے گا تو اور کس سے کرے گا۔ اتنی اچھی ہے وہ۔ بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ مجھ سے تو پہچانی نہیں جارہی تھی۔ نظر نہیں ہٹ رہی تھی اس پر سے۔" وہ اس کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔

"اچھا واقعی۔ اتنی خوبصورت ہوگئی ہے وہ؟"

"اور کیا۔" ابا جی اس کے لہجے میں اشتیاق کی جھلک دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

"تو پھر آپ خود کرلیں اس سے شادی' اماں جی کو میں منالوں گا۔" وہ مزے سے بولا۔

"دُر فٹے منہ تیرا۔ تو واقعی کھوتا ہے۔"

وہ چڑ کر بولے تھے۔ وہ سر جھکائے ان کے پاؤں دباتا رہا۔ کچھ لمحے اسی طرح خاموشی سے گزر گئے۔

"ابا جی۔ مجھے جانے دیں۔ مجھے سولہ جماعتیں کرلینے دیں۔ یہ میرا شوق ہے ابا جی!"

ان کے پاؤں دباتے ہوئے اب کی بار وہ خوشامدی لہجے میں بولا تھا۔ حقے کی ایک خوراک اور ناراض بیٹے سے اتنے دن بعد تفصیلی گپ شپ نے انہیں مخمور کردیا تھا۔ ان کی آنکھیں بند ہوتی جارہی تھیں۔

"تو چلا جائے گا تو میرے پاؤں کون دبائے گا یار! میں کیسے رہوں گا تیرے بغیر۔" بند ہوتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ وہ محبت بھرے لہجے میں بولے۔ ان کے لہجے میں ہتھیار ڈال دینے سے پہلے کی بے چارگی تھی۔ ایسی بے چارگی جو حریف کے حوصلوں کو بڑھا دیتی ہے۔ وہ زیادہ جوش سے ان کی ٹانگیں دبانے لگا۔

"دو تین سال کی بات ہے ابا جی!" وہ اب زیادہ اعتماد سے بات کررہا تھا کیونکہ ابا جی کے انداز سے نیم رضامندی صاف جھلک رہی تھی۔

"لاہور بہت دور ہے پترا!" انہوں نے بازو سر کے گرد پھیلا کر سابقہ انداز میں کہا۔

"چاند سے نزدیک ہے ابا جی! لوگ تو چاند کی زیارت بھی کر آتے ہیں۔"

اس کا منہ پھر سوجنے لگا تھا۔ ابا جی نے اس کے ہاتھوں کے ماند پڑتے لمس کو بخوبی محسوس کیا تھا۔ ان کے دل کو عجیب سے تاسف نے گھیر لیا۔ وہ جانتے تھے۔ بالآخر انہیں ضدی بیٹے کے آگے گھٹنے ٹیکنے پڑیں گے مگر دل میں یہی آرزو موجزن تھی کہ کسی طرح اسے اس کے ارادے سے باز رکھ سکیں۔

"اچھا یار! کرلے اپنے دل کی۔" لیٹنے سے پہلے انہوں نے رضامندی ظاہر کردی تھی۔

"سچ ابا جی۔ تھینک یو ابا جی!" وہ یکدم ان سے لپٹ گیا۔ ابا جی بند آنکھوں کے ساتھ مسکراتے رہے۔

اگلے دن سارے گاؤں میں شور مچ گیا تھا کہ وہ پڑھائی کے لیے "لہور" جارہا ہے۔ مسماۃ نسرین اس بات کی تحقیق کرنے خود ان کے گھر تک آئی تھی۔

"مت جاؤ نا۔ میں تمہارے بغیر مر جاؤں گی۔"

اس کا راستہ روک کر اس نے آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو بھر کر کہا تھا۔

"ہیں سچ۔ بعد میں مکر تو نہیں جاؤ گی؟" وہ سنجیدگی سے بولا۔

آگے کا سفر متقاضی تھا کہ وہ پیچھے کو بھول جائے۔ سو وہ صرف تقاضے پورا کررہا تھا۔ اس کے شوق کی تکمیل اس کے ہاتھوں کی لکیروں میں دوڑتی محسوس ہورہی تھی۔ والدین کی دعائیں سمیٹ کر اس نے منزل کی جانب سفر شروع کیا تھا اور یوں جب 80ء میں وہ لاہور آیا تو ان دنوں لاہور واقعی لہور ہوا کرتا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ ایک مہکتا ہوا دن تھا جب وہ گورنمنٹ کالج کے اقبال ہاسٹل کمرہ نمبر 7 میں پہنچا۔ بادامی باغ کے لاری اڈے سے کچہری روڈ اور پھر اقبال ہاسٹل تک اس کا دل عجیب سے انداز میں دھڑکتا رہا۔ گاؤں والوں نے اسے راجہ اندر بنا کر رکھا ہوا تھا' اس لیے اس کے لاشعور میں کہیں یہ خواہش دبی ہوئی تھی کہ جب وہ شہر پہنچے تو لوگ بار بچھا کے اس کا استقبال کریں۔ ہاسٹل کی طرف جاتے ہوئے اس کے دل و دماغ میں مسلسل تالیاں بجتی رہیں جو اس کے ہم مکتب اور اساتذہ اس کے لیے بجا رہے تھے۔ وہ شاعر اور ادیب نہیں تھا لیکن المیہ یہ تھا کہ وہ انہی کی طرح سوچتا تھا۔

اندر ہی اندر اسے کہیں غلط فہمی سی ہو گئی تھی کہ وہ ایک منفرد انسان ہے' اسی لیے اس نے اپنا سفر ایک مسافر کے بجائے ایک فاتح کی طرح شروع کیا تھا۔ اس کے ذہن میں کچھ عزائم تھے مگر ان عزائم کو پورا کرنے کے لیے اس نے خاص مقاصد طے نہیں کیے تھے۔ اسے پتا تھا کہ وہ اونچی اڑان بھرنا چاہتا ہے مگر اس کے لیے اسے پروں کو کس طرح استعمال کرنا ہے' اس چیز سے وہ یکسر لاعلم تھا۔ اسی لیے جب اس کا داخلہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ہوا تو اسے احساس نہیں تھا کہ وہ کتنا خوش قسمت ہے بلکہ وہ اپنی یہاں موجودگی کو گورنمنٹ کالج کی خوش قسمتی سمجھتا تھا۔

پہلا دھچکا اس کو ہاسٹل پہنچ کر لگا۔ کمرے کے دروازے کے باہر ایک موٹا سا تالا منہ چڑانے کے لیے تیار تھا۔ وہ لیٹ پہنچا تھا اس لیے کالج جا نہیں سکتا تھا۔ ہاسٹل کے باقی مکین شاید ابھی واپس نہیں آئے تھے' اس لیے کوریڈور میں سناٹا تھا۔ ریسیپشن پر اسے انتظار کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ وہ اپنے ٹرنک پر بیٹھ کر اس کے کمرے کے دوسرے مالک کا انتظار کرنے لگا۔ اسے وہاں بیٹھے بمشکل دس منٹ گزرے ہوں گے کہ پچھلے کوریڈور سے اس سے بھی زیادہ دبلا پتلا لڑکا آتا دکھائی دیا۔ وہ اس کے قریب سے گزر کر آگے کی سمت گیا اور پہلے کمرے میں گھس گیا۔ اگلے دس منٹ میں اس نے اسے دوبارہ کمرے سے نکلتے اور اپنے قریب آتے دیکھا۔

"نئے آئے ہو؟" چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ سجا کر اس نے پوچھا تھا۔

"کمرہ لاکڈ ہے۔ میں کچھ ہیلپ کروں؟" اثبات میں جواب پا کر وہ مزید پوچھ رہا تھا۔ وہ بے چارہ دیہاتی دل رکھنے والا اتنی ہمدردی کو ہی بہت سمجھ کر ایک بار پھر ہاں کہہ بیٹھا۔

وہ لڑکا دروازے کے قریب گیا اور تالے کو ہلا جلا کر دیکھتا رہا پھر اس کے پاس واپس آ کر بولا۔

"جاپانی تالا ہے۔ کسی دوسری چابی سے کھولنا مشکل ہے۔ دراصل یہ سعدی کا کمرہ ہے اور سعدی بہت سڑیل ہے۔ اس کی یہاں کسی سے کم ہی بنتی ہے۔ وہ باہر جاتے وقت اپنے کمرے کی چابی کسی کو نہیں دے کر جاتا' اس لیے توڑنا ہی پڑے گا۔"

وہ خاموشی سے اس لڑکے کی شکل دیکھتا رہا۔ بلاشبہ وہ ہونق لگ رہا تھا۔

"بیس روپے کا نیا تالا آئے گا اور دس روپے اس تالے کو توڑنے کے لگیں گے۔ کل ملا کر ہوئے تیس ہیں۔ ہتوڑ دوں؟"

وہ تخمینہ لگا کر بولا۔ مثبت جواب دینے کے علاوہ وہ بھی کیا سکتا تھا۔

"تم ریسیپشن پر جا کر ہتھوڑا لے کر آؤ۔" اس سوکھے سڑے لڑکے نے حکمیہ انداز میں کہا' وہ جانے لگا تو وہ بولا۔

"ارے یار۔۔۔ بات سنو۔۔۔ تیس روپے تو دے جاؤ۔۔۔ میں پچھلی طرف سے جا کر نیا تالا لے کر آتا ہوں۔"

اس نئے حکم پر وہ کچھ دیر سوچتا رہا' ہونقا یا بدعو نہیں تھا مگر نئے ماحول اور نئے لوگوں نے مل جل کر اس کی عقل کو منجمد سا کر دیا تھا۔ اس نے قمیص کی سائیڈ والی جیب سے والٹ نکالا اور گن کر پانچ روپے کے چھ نوٹ اس کے حوالے کر دیے اور خود ریسیپشن کی سمت چل دیا۔ اسے پانچ منٹ لگے تھے واپس آنے میں اور تب تک تالا کھل چکا تھا۔

"مارشل آرٹس کا نام سنا ہے کبھی۔۔۔ جاپانی کھیل کا ہے۔۔۔ ای۔۔۔ آ۔۔۔ او۔۔۔" وہ لڑکا ہوا میں بازو چلا کر منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکالنے لگا۔ "ایک ہاتھ کی مار تھا بجلی کی ضرب سے کھل گیا۔" وہ لڑکا کالر پر سے نادیدہ گرد جھاڑ رہا تھا۔ اس اہم فریضے سے فارغ ہو کر وہ اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے اپنے کمرے کی سمت چل دیا۔ سامان منتقل کرنے کا مرحلہ اتنا دشوار نہیں تھا۔ ایک ٹرنک' ایک بستر بند' چند ایک ضروری برتنوں کا تھیلا اور دیہاتی سوغاتوں والا مرتبان۔ ایک کے بعد ایک چیزیں اٹھا کر اس کو کمرے میں رکھتے ابھی ساعت ہی گزری ہو گی کہ دروازہ دھاڑ سے کھلا۔ وہ بیچارا ہڑبڑا کر پلٹا۔

"ہائے ابا جی!" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔ دروازے پر اونچے ڈیل ڈول والا ایک لڑکا کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں رجسٹر پکڑا ہوا تھا۔ "ہائے ابا جی" کی بانگ سن کر اس نے رجسٹر چہرے کے سامنے کر لیا پھر لحہ بھر بعد ہٹا کر بولا۔

"نان سینس۔۔۔ میں تمہیں ابا جی لگتا ہوں۔۔۔ بات کرنے کی تمیز نہیں ہے تمہیں۔۔۔ نام کیا ہے تمہارا؟" وہ اس کے بالکل۔۔۔ سامنے آ کر نہایت رعونت بھرے لہجے میں بولا۔

"غلام مرتضیٰ۔" اس نے پریشانی کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"باپ کا نام؟" وہ شخص اس کے سامان کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"غلام مجتبیٰ۔" اب وہ بالکل سیدھا کھڑا تھا۔ پریشانی کی بیچارگی تھی اور اب اندر ہی اندر خفگی بھی جاگ رہی تھی۔

"کتنے بہن بھائی ہو؟"

"دو۔"

"ذریعہ' آمدنی؟"

"ابا جی۔" اس نے صاف گوئی سے کہا تھا۔ وہ شخص اس سے پوچھ پوچھ کر رجسٹر میں لکھ بھی رہا تھا۔

"ابا جی کیا بینک ڈرافٹ ہیں' جنہیں بینک میں لے جا کر جمع کرواتے ہو اور رقم نکلوا لاتے ہو۔"

وہ شخص تنک کر بولا۔ اس تذلیل پر مرتضیٰ کی کانوں کی لویں سرخ ہونے لگی تھیں۔ اپنے باپ کے بارے میں وہ بہت جذباتی تھا۔ اپنے سامنے کھڑے شخص کی وجہ سے وہ پریشان ضرور ہو رہا تھا مگر اتنا نہیں کہ ہر بات برداشت کر لیتا۔

"نہیں۔۔۔ میرے ابا جی میرے پرائز بانڈ ہیں' جو میری ہر ضرورت پر خود بخود نکل آتے ہیں۔ بینک ڈرافٹ جیسے ابا تو اللہ ہمارے دشمنوں کو بھی نہ دے جسے نکلوانے کے لیے ٹوکن کی ضرورت پڑتی ہے۔"

وہ ترخ کر بولا۔ معاشیات کے مضمون میں کبھی کی پڑھی گئی بات کام آ گئی تھی۔

"بکواس نہیں کرو اور عمر کے بارے میں بتاؤ۔" وہ شخص چہرے کے تاثرات چھپا کر سابقہ لہجے میں استفسار کر رہا تھا۔

"حضرت عمرؓ دوسرے خلیفہ تھے۔ ان کے عدل کے بہت قصے مشہور ہیں۔"

اب کی بار اس نے جان بوجھ کر حاضر جوابی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اسے اپنی بات کے جواب میں قہقہہ سنائی دیا تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ یہ آواز کہاں سے آئی ہے کیونکہ اس کے سامنے کھڑا شخص سپاٹ چہرہ لیے کھڑا تھا۔

"اوئے پینڈو۔۔۔ تمہاری عمر کیا ہے۔۔۔؟ آج۔۔۔ خیر سے اس سال کون سی ویں بہار بیگم دیکھنی ہے۔" وہ اسے گھورتے ہوئے بولا تھا۔

"بیس سال کا ہوں جی' میری منگنی ہو چکی ہے اور میری منگیتر کا نام نسرین ہے۔"

اب کی بار وہ بھی تنک کر بولا تھا۔ ان کے یہاں اس قسم کے انٹرویو تب ہی کیے جاتے تھے' جب بہن یا بیٹی کا رشتہ دینا ہوتا تھا۔ اس نے اپنی منہ بولی منگیتر کا نام بھی صرف اس لیے لیا تھا کہ اس شخص کو مزید پیش قدمی سے روک سکے۔ دراصل یہ ایک قسم کی بھبتی تھی جو اس نے پوری طاقت سے کسنے کی کوشش کی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ شخص اس کے طنز سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

"لے بھئی۔۔۔ یعنی کہ منگنی شدہ ہو۔۔۔ آئے کہاں سے ہو؟" اب کی بار اس شخص کے لہجے میں ذرا نرمی تھی۔

"سرگودھا۔" اس نے جان بوجھ کر گاؤں کا نام نہیں بتایا۔

"تمہارا اٹیچی کیس کہاں ہے؟"

"نہیں ہے۔" اس جواب پر اس شخص نے پھر اسے گھورا۔ مرتضیٰ نے کمرے میں داخل ہو کر وہ ٹرنک چارپائی کے نیچے گھسا دیا تھا۔

"کوئی بکسا وغیرہ؟"

"وہ بھی نہیں ہے۔"

"سامان کس میں رکھ کر لائے ہو؟" تفتیش ابھی جاری تھی۔

"بس میں۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

"اوف۔ بس میں رکھنے سے پہلے کس میں رکھا تھا؟" وہ شخص اب زچ ہونے لگا تھا۔

"ٹرنک میں۔" مرتضیٰ ذرا کی ذرا شرمندہ ہو کر بولا۔

"کہاں ہے؟ دکھاؤ۔" حکم دیا گیا۔

"دیکھیں جناب! کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ آپ پہلے اپنا تعارف کروا دیں۔ آپ اتنی دیر سے مجھ سے سوال پر سوال کیے جا رہے ہیں۔ مجھے بھی تو بتائیے کہ آپ مجھ سے تھانے داروں کی طرح تفتیش کیوں کر رہے ہیں؟"

مرتضیٰ نے بہت نرمی سے سوال کیا تھا۔ وہ شخص جس طرح انٹرویو کر رہا تھا' اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ واقعی اتھارٹیز میں سے ہے لیکن مرتضیٰ کو یہ بھی ڈر تھا کہ کوئی واقعی اسے پینڈو سمجھ کر بدھو نہ بنا جائے۔

"ڈیل۔ یو آر رائٹ۔۔۔ میرا نام وقاص چودھری ہے۔ میں سیکشن انچارج ہوں۔ روم نمبر 1 سے 17 تک میں ہی سب کو ڈیل کرتا ہوں۔ تم نئے آئے ہو' اس لیے صفحہ نمبر 20 پر دیے گئے ہاسٹل کے ٹائٹل کے اندر دیے گئے

تمام کوڈز تک کنڈکٹ دوبارہ پڑھ لو۔ وہاں سب فیکلٹی کے نام اور ان کو حاصل اتھارٹی کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے۔ میں ہاسٹل پریمیسز میں جس تدوم میں چاہوں جاکر چیکنگ کرسکتا ہوں۔ سمجھے چینڈو۔۔۔ اب کھولو ٹرنک۔"

وہ نرمی سے بات کرتا پھر سابقہ ٹون میں بولا۔ مرتضیٰ نے یہ ساری باتیں پڑھی تھیں لیکن فیکلٹی کے نام اس کے ذہن میں نہیں تھے۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اس نے ٹرنک گھسیٹ کر چارپائی کے نیچے سے نکالا اور اس کے سامنے نامہ اعمال کی طرح کھول کر رکھ دیا۔

"جینٹ شرٹ نہیں پہنتے تم؟" اس کی سلیقے سے کوئلوں والی استری سے پریس کیے گئے شلوار قمیصوں کو وہ بے دردی سے الٹ پلٹ کرتا بول رہا تھا۔

"نہیں۔" اس نے سادگی سے جواب دیا۔ اس کی نظریں اس کے ہاتھوں کی جانب تھیں جو بے دردی سے اس کی چیزوں کا پوسٹ مارٹم کررہا تھا۔ نجانے وہ کیا جانچنا چاہ رہا تھا۔ وقاص چودھری کے ہاتھ اب ٹرنک کے نچلے حصے کی تلاشی لے رہے تھے۔ مرتضیٰ عجیب سی خجالت محسوس کرنے لگا تھا۔ ٹرنک کے نچلے حصے میں ذاتی ضرورت کی کچھ ایسی چیزیں تھیں جنہیں وہ نہ دیکھتا تو بہتر تھا لیکن چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔

"یہ کیا ہے؟" بالآخر وہی ہوا جس کا مرتضیٰ کو ڈر تھا۔ اس نے بہت بیچارگی سے نظریں اٹھا کر وقاص چودھری کے ہاتھوں کی جانب دیکھا۔

"کچھا ہے جی!" وقاص چودھری کے منہ سے قہقہہ ابلا تھا۔ اس کے ہاتھ میں موجود وہ کاٹن کی ہاتھ سے سلی ہوئی "نیکر" کسی مضحکہ خیز چیز سے کم نہیں تھی۔

"بہت اچھا ہے جی۔" وہ اس کی نقل اتارتے ہوئے بولا۔

"اس کا کیا کروگے؟" وہ شرارتی انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"اس سے نہاؤں گا۔" وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ اس سے زیادہ شرمندگی اب ہو بھی نہیں سکتی تھی۔

"تم پانی سے نہیں نہاتے؟" شرارت اور مسکراہٹ نے مل جل کر رعونت بھرے چہرے کو کافی نارمل کردیا تھا مگر مرتضیٰ کو اس چہرے سے ازحد الجھن محسوس ہورہی تھی' وہ خاموش رہا۔

"اوئے ہوئے۔۔۔ کام کی چیز تو اب ملی ہے۔" اس کے ہاتھ اب ایک استرا لگا تھا۔ مرتضیٰ کو سفر کی تکان بھی تھی اور اس ساری گفتگو نے تو اسے بالکل ہی مضمحل کردیا تھا۔

"تمہیں پتا ہے یہاں اسلحہ رکھنا منع ہے۔" اس شخص کے لہجے میں یکدم سختی جھلکنے لگی تھی۔

"یہ اسلحہ کب ہے یہ تو استرا ہے۔" وہ تڑپ کر بولا تھا۔

"اس کو بھی ہم دیسی اسلحہ ہی کہتے ہیں۔ کیا کیا نہیں ہوسکتا اس سے۔ شاہ رگ پہ محبت سے پھر جائے تو بندہ پہلی فلائٹ میں اللہ کے حضور آن ایئر چلا جاتا ہے اور تم کہتے ہو یہ اسلحہ کب ہے؟"

وہ اب استرے کو ہاتھ پر بہت احتیاط سے پھیر رہا تھا۔ اس کا پھل واقعی بہت تیز تھا۔

"یہ میں نے کسی غلط مقصد کے لیے نہیں رکھا۔ شیو کرنے کے لیے رکھا ہے۔" وہ صفائی دینے والے انداز میں بولا تھا۔

"اوئے مجھے دغا دینے کی کوشش کرتے ہو' یہ ریزر ہے جو اس سے شیو کروگے تم۔۔۔ جھوٹ مت بولو۔۔۔ سچ سچ بتاؤ اس اسلحے کا کیا کروگے تم؟ اگر تم نے مجھے سچ بتادیا تو میں تمہاری شکایت نہیں کروں گا' ورنہ۔۔۔ شکل سے تو تجھ دار ہی لگتے ہو۔" وہ ایکبار پھر اسے گھورنے لگا۔

"میرا یقین کریں چودھری صاحب۔۔۔ یہ شیو کرنے کے لیے ہی رکھا تھا میں نے۔ مجھے اگر پتا ہوتا۔۔۔"

وہ منمنا رہا تھا مگر چودھری صاحب نے بات کاٹ دی۔

"اگر پتا ہوتا تو یقیناً تم اسے نائن نو الیون یعنی نو دو گیارہ کردیتے ہے نا۔ اچھا ہوا جو میری نظر اس پر پڑ گئی۔"

وہ شخص ٹس سے مس نہیں ہورہا تھا۔

"میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں۔۔۔ آپ۔۔۔" وہ بیچارا روہانسا ہو چلا تھا۔

"ویل۔۔۔ اوکے۔۔۔ کرلیتا ہوں یقین کہ یہ اسلحہ شیو کرنے کے لیے ہے مگر تم مجھے اس سے شیو کرکے دکھاؤ۔" ایسے فرمائش کی گئی جیسے بچے لاڈلی باپ کی کرتے ہیں۔

"یہ دیکھیں' ایسے کرتے ہیں۔" وہ استرا چہرے پر پھیر کر بولا تھا۔

"ارے یار! گلستان میں گل ہی نہیں تو گل پاشی کہاں

سے ہوگی۔ اچھا ٹھہرو مجھے سوچنے دو۔۔۔ ہم۔۔۔"

وہ منہ پر انگلی رکھ کر کھڑا تھا۔

"میرے ساتھ آؤ۔" وہ قدرے اونچی آواز میں بولا جیسے کسی اور کو سنانا مقصود ہو۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر وہ دروازے سے باہر نکلا۔ مرتضیٰ کو محسوس ہوا جیسے اس نے کسی کے بھاگنے کی آواز سنی ہے مگر اس نے دھیان نہیں دیا۔ سورت حال اس کے لیے اتنی عجیب و غریب ہو چلی تھی کہ اس کا دھیان خود بے دھیان ہو چلا تھا۔

"کمرہ نمبر 3 میں گل شیر ہے۔ اس کی داڑھی کافی بڑھی ہوئی ہے۔ اس کی شیو کرکے دکھاؤ۔" وہ اس کو مطلوبہ کمرے کے سامنے لے جاکر بولا۔

"میں یہیں کھڑا تمہارا انتظار کررہا ہوں۔ فوراً واپس آؤ۔" انداز ایک بار پھر حاکمانہ ہو چکا تھا۔ وہ بیچارا جھجکتے ہوئے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ کمرے میں دو چارپائیاں تھیں جس میں سے ایک خالی جبکہ دوسری پر ایک گورا چٹا لڑکا سو رہا تھا۔ اس کی شیو واقعی بڑھی ہوئی تھی۔

مرتضیٰ نے ڈرتے ڈرتے ابھی اس کے چہرے پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ اس شخص نے پٹ سے آنکھیں کھول کر اس کا ہاتھ پکڑلیا۔ ستم یہ کہ اس ہاتھ میں استرا ابھی موجود تھا۔

"خانہ خراب کا بچی' ہمارا عزت پر حملہ کرتی ہے۔" انگریز نظر آنے والے اس لڑکے کے منہ سے خالصتاً پشتو لہجہ اور جملہ بھی ایسا کہ ٹھیک ٹھاک دفع لگ سکتی تھی۔

"وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ میں۔۔۔" اس کے منہ سے یہی نکل سکا اور اس نے پوری طاقت سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور دروازے کی سمت بھاگا مگر دروازہ باہر سے بند کردیا گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"آج پھر جینے کی تمنا ہے' آج پھر مرنے کا ارادہ ہے۔" خوابیدہ احساسات کو مترنم سی آواز بھی کلی طور پر بیدار نہیں کرپائی تھی۔ یہ سریلی آواز کافی دیر سے اس کی سماعتوں کو سیراب کرنے کی کوشش کررہی تھی مگر اس کے حواسوں پر نیند کا اس قدر غلبہ تھا کہ وہ چاہتے ہوئے بھی اس کے سحر سے نکل نہیں پا رہا تھا۔

"یار! اب اٹھ جاؤ' میں کافی دیر سے تمہارے جاگنے کا انتظار کررہا ہوں۔" کسی نے بہت محبت بھرے لہجے میں کہا تھا۔ سریلی زنانہ آواز جس کوشش میں ناکام ہورہی تھی' مردانہ کھردری آواز نے چٹکی میں وہ کام کردکھایا تھا۔ وہ چارپائی پر چت لیٹا تھا۔ حواس بیدار ہوئے تو وہ ساری صورت حال بھی ذہن میں گھومنے لگی جو اس کے سونے سے پہلے وقوع پذیر ہوئی تھی۔ اسے ایک دم سے انتہائی ذلت محسوس ہوئی۔ اگر اسے پہلے سے اس کے متعلق کوئی آئیڈیا ہوتا تو شاید وہ اس بے عزتی کو ہنسی کھیل کر برداشت کرلیتا مگر اب تو اسے اس تذلیل کو سوچ کر ہی جھرجھری آگئی تھی۔

"یار! اٹھ جاؤ اب' مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔ میں نے تمہاری وجہ سے اب تک کھانا نہیں کھایا۔"

وہی میٹھی سی مگر مردانہ آواز اسے پھر سنائی دی تھی۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ ساتھ والی چارپائی پر لیٹا ہوا وہ لڑکا اسے وقاص چودھری اور گل شیر کا تیسرا بھائی لگا تھا۔ اس نے اس کے چہرے پر پھیلی دوستانہ مسکراہٹ کو بھی یکسر نظرانداز کردیا۔ وہ کسلمندی سے اٹھنے لگا۔ اسے اٹھتا دیکھ کر وہ لڑکا بھی چھلانگ مارنے والے انداز میں چارپائی سے اترا تھا۔

دھاریوں والی قمیص کے ساتھ وہ سیاہ رنگ کی پتلون پہنے ہوئے تھا۔ اس کا ہیئر کٹ کافی ٹرینڈی اور اسٹائلش تھا۔ مرتضیٰ کو اس سے خوف محسوس ہوا تھا۔ جب اسی نظر آنے والے لوگ اتنی بے عزتی کرسکتے تھے تو وہ تو حلیے سے بھی بدلی لگ رہا تھا۔ اس کی شیو ہلکی سی بڑھی ہوئی تھی جو اس کی گندمی رنگت پر بڑی جچ رہی تھی۔ اس کی مونچھیں بھی بڑی متناسب سی تھیں جو اگر کسی اور کے چہرے پر ہوتیں تو کبھی نہ جچتیں۔ مجموعی طور پر وہ ایسا لڑکا تھا جس نے مرتضیٰ کے دل میں کڑے احساس کمتری کے بیج کو لمحہ بھر میں تناور درخت بنادیا تھا۔

"اباجی! آپ مجھے روک نہیں سکتے تھے۔" اس نے چڑ کر سوچا پھر خود ہی شرمندہ ہوگیا کیونکہ اباجی کی التجائیں یاد آتی تھیں۔

"میرا نام سعدی ہے۔۔۔ فورتھ ایئر میں ہوں۔" وہ اس کے بالکل سامنے آکر ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ مرتضیٰ نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھانے میں بھی ایک منٹ لگادیا تھا اور جب تک اس کا ہاتھ سعدی کے ہاتھ میں

رہا۔ اسے یہی خدشہ رہا کہ سعدی نامی وہ لڑکا ابھی اسے دھوبی پٹکا دے کر نیچے گرا دے گا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ اس لڑکے نے اپنے ہاتھ سے سہارا دے کر اسے اٹھنے میں مدد دی تھی۔ مرتضیٰ کسی معمول کی طرح اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"میں تمہارا روم میٹ ہوں یار! اگر تم میرے ساتھ اس طرح برتاؤ کر رہے ہو جیسے میں تمہارا سوتیلا بیٹا ہوں... ایسے تو گزارا نہیں ہوگا میری جان۔" وہ اس کا ہاتھ چھوڑ کر کمرے میں لگے آئینے میں دیکھ کر بال بنانے لگا۔

"نام کیا ہے تمہارا؟" مرتضیٰ کو خاموش دیکھ کر اس نے آئینے میں نظر آتے اس کے عکس کو دیکھ کر پوچھا تھا۔

مرتضیٰ کا جی چاہا کہہ دے "الو کا پٹھا" مگر دل کی آواز دبا کر اس نے اپنا صحیح نام بتا دیا تھا۔ سعدی نے سر ہلایا پھر اس کا سپاٹ چہرہ دیکھ کر کندھے اچکاتے ہوئے دروازے کی سمت بڑھا۔ دروازے کے باہر پہنچ کر وہ مرتضیٰ کا انتظار کرنے لگا تھا۔ اس کے باہر آنے کے بعد اس نے دروازے کو لاک نہیں کیا بس کنڈی لگا دی تھی۔ مرتضیٰ نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ سعدی اس کی حیرت کو بھانپ گیا۔

"یار! یہاں کون سا خزانہ رکھا ہے۔ میں زیادہ تر کمرے کو اسی طرح کھلا چھوڑ جاتا ہوں۔ زیادہ دن کے لیے کہیں باہر جاؤں تب بھی میں نے کمرہ لاک نہیں کیا۔"

وہ دونوں کوریڈور میں ساتھ چل رہے تھے۔ اتنی بڑی مبالغہ آرائی پر مرتضیٰ نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔ خواہش تو یہ تھی کہ کوئی سخت جملہ کہے مگر اسے کوئی مناسب جواب نہیں سوجھا، سو خاموش رہا جبکہ سعدی بہت باتونی معلوم ہوتا تھا۔

"اگر کبھی تمہیں یہ کمرہ لاکڈ ملے تو پریشان نہ ہونا... وہ آٹو لاک ہوتا ہے، جھٹکا دینے سے کھل جاتا ہے... یار کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی کہ کمرہ لاک کروں... یہاں کسی میں اتنی جرات نہیں کہ سعدی سے پنگا لے۔ سو کمرہ بند ہو یا کھلا... اٹ میکس نو ڈفرنس... تم میرے روم میٹ ہو، اس لیے تمہارا اور میرا تعلق ذرا مختلف ہوگا۔ ایک بات میں تمہیں واضح بتاؤں کہ یہاں کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے، کسی سے مرعوب بھی نہیں ہونا، کسی سے متاثر ہونے کی کوشش بھی نہیں کرنی... سوائے... میرے۔"

اتنا کہہ کر سعدی نے اس کی جانب دیکھا پھر اس کے چہرے پر پھیلی تشویش دیکھ کر دوبارہ اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

"یار! میں کوئی پرنس چارلس نہیں ہوں بس دراصل تھوڑا سا خود پسند ہوں اور موڈی ہوں... بد تمیز نہیں ہوں... ویسے تمہیں کیا لگا ہوا میں کیسا ہوں؟"

وہ کوریڈور کے آخری کنارے پر تھے جب سعدی نے پوچھا۔ مرتضیٰ اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

"اچھا یار... آئی ایم سوری... اب ایسے مت دیکھو مجھے کہ میں شرمندگی محسوس کرنے لگوں۔" وہ چڑ کر بولا۔

"مجھے بیت الخلاء جانا ہے۔" وہ اپنی ہی مصیبت میں تھا سو شرمندہ لہجے میں بولا۔

"ہیں... کہاں جانا ہے؟" سعدی نے حیرانی سے پوچھا۔ مرتضیٰ کو دل ہی دل میں بہت حیرت ہوئی۔ اسے بے وجہ فرنگیوں کی تقلید میں بے حال لوگوں سے ویسے ہی بہت چڑ ہوتی تھی۔

"باتھ روم جانا ہے۔" اس نے وضاحت کی۔

"اچھا اچھا... باتھ روم اس طرف ہے... میں یہیں کھڑا ہوں، تم جلدی سے واپس آؤ۔ ہم اکٹھے ڈائننگ ہال تک چلیں گے۔"

اس نے اشارے سے بتایا۔ مرتضیٰ اسی سمت چل دیا اور دس منٹ بعد جب وہ واپس آیا تو سعدی سچ مچ وہیں تھا۔ ڈائننگ ہال پہنچنے تک ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ البتہ وہاں... جا کر مرتضیٰ کو کافی حوصلہ ہوا کیونکہ وہاں اسے بہت سے ایسے نمونے دیکھنے کو ملے جو تقریباً اس کے جیسے ہی تھے۔

کھانا کھانے کے لیے میز کا انتخاب بھی سعدی نے کیا۔ کچھ لمحوں کے بعد تین اور لڑکوں نے ان کی میز کے گرد نشست سنبھال لی تھی۔ وہ سعدی کے اچھے دوستوں میں سے لگ رہے تھے۔ وہ تینوں شخصیت میں مرتضیٰ سے بہتر اور سعدی سے کم تر تھے مگر ان کا انداز گفتگو اور کھانا کھانے کا سلیقہ بالکل سعدی کے جیسا تھا۔

"یہ قورمہ پاس کرنا پلیز۔" ایک لڑکے نے مرتضیٰ سے کہا۔ مرتضیٰ کو خاک سمجھ میں نہیں آیا۔ اسے نہیں پتا تھا کہ قورمہ پاس کیسے ہوتا ہے اور فیل کیسے ہوتا ہے۔ اس نے آج تک انسانوں کو ہی فیل یا پاس ہوتے دیکھا تھا۔ اس کے کچھ کہنے سے پہلے سعدی نے قورمے والا ڈونگا اٹھا کر مذکورہ لڑکے کو تھما دیا۔

"سعدی تو ایسے پاس ہوتا ہے قورمہ... یعنی اگر یہ سعدی ڈونگا اٹھا کر اسے نہ دیتا تو قورمہ فیل ہو جاتا۔"

اس نے تندوری روٹی کے چہرے پر چمکنے والے بھورے بھورے نشانوں کو دیکھ کر سوچا تھا۔ ڈائننگ ہال میں ہی اسے وہ چہرے یاد آئے، جنہوں نے اس کی درگت بنائی تھی۔ کھانے سے فراغت کے بعد سعدی اور اس کے علاوہ وہ تینوں لڑکے یکے بعد دیگرے اٹھ کر چل دیے تھے۔

"گل شیر لوگوں سے تمہارا کیا پھڈا ہوا ہے؟" ان کے جاتے ہی سعدی نے پوچھا تھا۔

مرتضیٰ کا دایاں گال یکدم گرم ہو گیا۔ گل شیر کا ہاتھ واقعی پٹھان بچے کا ہاتھ تھا۔ اسے وہ ذلت یاد آئی۔ کتنی مشکل سے وہ گل شیر کو اصل بات سمجھا پایا تھا اور حقیقت سے آگاہ ہونے کے بعد اس کے چہرے پر وہی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اس نے تمہیں مارا ہے؟" سعدی نے اس کی خاموشی سے خود ہی کسی نتیجے پر پہنچ کر کہا۔ مرتضیٰ کا دل چاہا میز ہی الٹ دے۔

"کتنے دیوان شائع ہو چکے ہیں تمہارے؟" اس بار سعدی نے عجیب و غریب سوال کیا تھا۔

"اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ تم ہر پانچ منٹ بعد کسی شاعر کی طرح عالم استغراق میں گم ہو جاتے ہو۔ اگر ایسے "جراثیم" ہیں تو یار! مجھے پہلے ہی بتا دو، مجھے ایسی چیزوں سے الرجی ہے اور ہاں، میرے پاس اتنا فالتو وقت نہیں ہے کہ تم پر خرچ کرتا چلا جاؤں۔ قسمت نے تمہیں میرا روم میٹ بنا دیا ہے تو شکر ادا کرو۔ کالجز میں مذاق وغیرہ کوئی انوکھی بات نہیں لیکن کسی کو کسی پر ہاتھ اٹھانے کا حق نہیں ہے۔ تمہیں اس کے خلاف اسٹینڈ لینا چاہیے۔ دیہاتی ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ انسان اپنی عزت نفس کو بھول جائے۔ جب میں یہاں آیا تھا تو صرف سولہ سال کا تھا۔ میں نے بھی ایسے مذاق کا سامنا کیا تھا لیکن کسی مائی کے لال میں یہ جرات پیدا نہیں ہونے دی تھی کہ وہ مجھ پر ہاتھ اٹھائے۔ تمہیں یہ سب اس لیے بتا رہا ہوں کہ تم مجھ سے چھوٹے ہو اور قسمت نے تمہیں میرا روم میٹ بنا دیا ہے اور..."

"اور یہ کہ شکر الحمدللہ کیونکہ قسمت نے مجھے تمہارا روم میٹ بنا دیا ہے۔ گل شیر بلکہ گل ہاتھی نے مجھے نا صرف تھپڑ مارا ہے بلکہ گالی بھی دی ہے اور میرا گریبان بھی پکڑا ہے۔ ابا جی کی قسم، بدلہ تو میں ان سب سے ضرور لوں گا مگر وقت آنے پر اور اپنے طریقے سے، ایک بات۔ دوسری بات یہ کہ عزت نفس کی یہاں کمی نہیں ہے۔ راجپوتوں کا خون ہوں، کوئی ذلیل کہہ کر جائے گا کہاں، میری لاعلمی کو میری حماقت نہ سمجھا جائے۔ ہوائی جہاز بھی اڑنے سے پہلے جھٹکا کھاتا ہے۔ اس جھٹکے کو اس کی ناکامی سمجھنے والے لوگ دراصل بے وقوف ہوتے ہیں۔ تیسری، تم کس خوشی میں میری ماں بننے کی کوشش کر رہے ہو۔ تمہارے مجھ سے کیا مفادات وابستہ ہیں۔ کچھ ان پر بھی تو روشنی ڈالیں سرکار!"

وہ پھٹ کر جو بولنا شروع ہوا تو پھر چپ کرانا مشکل ہو گیا۔ سعدی حیرت کے بجائے متاثر ہونے والے انداز میں اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ ڈائننگ ہال میں زیادہ لوگ نہیں تھے اور جو تھے، وہ اپنی مصروفیات میں گم تھے، اس لیے ان کی جانب کسی کا دھیان نہیں تھا۔

سعدی کے چہرے پر لمحہ بھر کے لیے حیرت کی رمق چمکی اور پھر غائب ہو گئی۔

"اوہو... تو تمہیں سب کچھ پتا چل گیا... اب کیا ہوگا... تمہارا اندازہ بالکل ٹھیک ہے۔ یار! میں واقعی ایک کمینہ آدمی ہوں بلکہ جدی پشتی کمینہ ہوں۔ والد صاحب ہیروئن کا کاروبار کرتے ہیں۔ بھائیوں نے اس کاروبار کو ترقی دی۔ میرا ارادہ بھی یہی کرنے کا ہے۔ میرے کمرے میں ہیروئن کی پڑیا بھی ہیں۔ جی بی کی قسم تو میں نے تم جیسے چغدوں کو ٹریپ کرنے کے لیے بھری ہے لیکن دیکھو خدا کے لیے یہ بات کسی کو مت بتانا ورنہ میں برباد ہو جاؤں گا۔ میرا گھر نہیں بچے گا۔"

وہ اتنی سنجیدگی سے بولا تھا کہ مرتضیٰ دل ہی دل میں یقین نہ کرنے کے باوجود اسے آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ وہ اس علاقے سے آیا تھا، جہاں لوگ بھنگ پر اکتفا کرتے تھے۔

"تم مذاق کر رہے ہو؟" اس نے بے یقینی سے اس کی جانب دیکھا۔

"نہیں نہیں، گھاس کھود رہا ہوں۔ ہونہہ... میرا کیا مفاد وابستہ ہو سکتا ہے احمق آدمی... شکل سے ہی سو وار جی نظر آنے والے چغدو، تمہارا خود اپنے آپ کو کوئی فائدہ نہیں ہے، تم نے مجھے کیا فائدہ پہنچانا ہے۔"

وہ ذرا چڑ کر بولا تھا۔ مرتضیٰ کو لگا، سعدی کا چہرہ دکاس چودھری کے جیسا ہو گیا ہے۔

"مشکل سے تم بھی مونچھوں والی لیڈی ماؤنٹ بیٹن لگتے ہو' میں نے تو نہیں جتایا تمہیں۔ میری طرف سے بھی لونسے۔ اس سے بہتر تو ہم سلانوالی میں تھے۔ لعنت ہے ایسی پڑھائی پر۔"

وہ سعدی کا ہی انداز اپنا کر بولا تھا۔ سعدی نے ملنے والے "لقب" کو بہت مشکل سے برداشت کیا تھا۔ اس کے بعد کچھ گہرے سانس بھر کر وہ اس کی جانب دیکھنے لگا۔ مرتضیٰ کے چہرے پر زمانے بھر کی بیزاری تھی۔

"یار' تم نے واقعی میرے اندازے کی تصدیق کی ہے۔ تمہاری آنکھوں کی چمک مجھے بتا رہی تھی کہ میں تم کو کب کچھ نظر آتے ہیں بچو۔ اسے شاعری نہ سمجھنا' میں اسے محاورہ کہتا ہوں اور یار! تم سے کیا چھپاؤں کیونکہ قسمت نے تمہیں..... اچھا چلو چھوڑو۔ اب ہمیں ڈیڑھ سال تک اکٹھے رہنا ہے۔ بتانا یہ تھا کہ میں اتنا برا انسان نہیں ہوں' بس مجھ میں ایک خرابی ہے۔ میں شاعر ہوں' تم اسے ہی میرا اعتراف سمجھ لو۔"

اس نے ایسے کہا تھا جیسے جرم کا اعتراف کر رہا ہو' مرتضیٰ کو اس کا بدلا ہوا یہ روپ زیادہ اچھا لگا تھا۔ اسے لگا وہ دونوں لب بے وقوفی میں ایک مقام پر آکھڑے ہوئے ہیں۔ اور پھر سعدی نے اس کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ جسے اس نے پورے خلوص سے تھاما تھا۔

"یار! کیا میں واقعی مونچھوں والی لیڈی ماؤنٹ بیٹن لگتا ہوں؟" اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے سعدی نے پوچھا تھا پھر وہ دونوں قہقہہ لگا کر ہنس دیے تھے۔

☆ ☆ ☆

تین دن بعد جمعہ آگیا تھا۔

جمعرات کو ویک اینڈ منانے کے چکر میں سب ہی تاخیر سے سوتے تھے۔ سو جمعہ کو جلدی اٹھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جمعے کے روز ہاسٹل میں زندگی پہلی انگڑائی دس بجے کے قریب لیتی تھی پھر آہستہ آہستہ بیداری کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔

جن لوگوں کے عزیز و اقارب لاہور میں مقیم تھے' وہ وہیں حاضری لگوانے چلے جاتے۔ کوئی وارڈروب سیٹ کرنے میں مگن ہو جاتا' کسی کو ہفتہ بھر کے کپڑے استری کرنا ہوتے تھے۔ کسی کو گھر والوں یا محبوباؤں کو خط لکھنے ہوتے تھے۔ سو وہ اس میں مصروف ہو جاتے مگر یہ سب کام دوپہر کے بعد شروع ہوتے تھے۔

چھٹی کے دن ایک بات یقینی تھی کہ کوئی کسی کو عتاب مول نہیں لیتا تھا۔

اس جمعہ کو اقبال ہاسٹل کی تاریخ میں شاید پہلی بار ہوا کہ کمرہ نمبر 7 میں دائیں چارپائی پر سوئے لڑکے نے بائیں چارپائی پر سوئے لڑکے کو جگا دیا تھا۔ بائیں چارپائی والا اٹھنے میں ذرا نخرے سے کام لے رہا تھا۔

"اگر میرا مینوں کی اولاد ہے تو اسی طرح سوتا رہ۔"

اس طعنے پر بائیں چارپائی والا کروٹ بدل کر دوبارہ سونے کی تیاری کرنے لگا تھا جس پر دائیں والے نے اس کی پشت پر زوردار دھپ رسید کیا تو بائیں چارپائی والا بھنا بھوں چڑھاتا اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر ان دونوں نے پاؤں میں ہوائی چپل ڈالے اور کمرے کا دروازہ نہایت آہستگی سے کھول کر کوریڈور میں نکل گئے۔ صبح چھ بجے کے قریب وقت تھا' ہاسٹل کے نا صرف مکین بلکہ در و دیوار بھی خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ سردیاں آنہیں رہی تھیں اور گرمیاں جا نہیں رہی تھیں۔ موسموں کی اس ذاتی چپقلش نے عجب خوشگواریت پھیلا رکھی تھی۔

وہ دونوں نہایت آہستگی سے چلتے ہوئے کمرہ نمبر 21 کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ہوائی چپلوں کے باعث ان کے قدموں کی چاپ نہ ہونے کے برابر تھی۔ کمرہ نمبر 21 کے باہر پہنچ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکے۔ یہ کمرہ عباس راہی اور وقاص چودھری کا تھا۔ عباس راہی وہی لڑکا تھا جس نے دائیں چارپائی والے لڑکے سے تالا توڑنے کے تیس روپے اینٹھے تھے۔ یہ دونوں رات کسی پارٹی میں مدعو تھے' جہاں جانے کے لیے انہوں نے بہترین ڈریسنگ کی تھی اور لیٹسٹ فیشن کے دیرز پہنے تھے۔ وقاص چودھری کا بڑا بھائی دوبئی سے پچھلے مہینے بہت مہنگے لیڈر کے بوٹ لایا تھا۔ یہ اسٹائلش سے بوٹ سارے ہاسٹل کو دکھا کر اس نے خوب شیخیاں بگھاری تھیں۔ رات کو پارٹی میں اس نے یہی بوٹ پہنے تھے جبکہ عباس راہی کی پشاوری چپل بھی بہت اعلا تھی اور سب سے بڑھ کر کل رات پہلی مرتبہ پہنی گئی تھیں۔ پارٹی سے لوگ عموماً "لیٹ" واپس آتے ہیں۔ جوتے باہر سے اتار کر کمرے کے اندر رکھنا بھول جاتے ہیں۔ شامت کوئی چیتھی دے کر تو آتی نہیں ہے' سو وقاص چودھری اور عباس راہی کے جوتوں کی شامت آگئی تھی۔ کمرہ نمبر 21 کے باہر موجود ان دونوں لڑکوں نے بڑی خاموشی سے وہ جوتے اٹھا لیے۔ اب ان کا رخ کمرہ نمبر 27 کی طرف تھا۔ یہاں بھی دو لڑکے رہتے تھے۔ کمرہ 21 اور 27 کے مکینوں میں خوب دوستانہ تھا' سو وہ پارٹیز پر اکٹھے جاتے تھے مگر کمرہ نمبر 27 کے لوگ کمرہ نمبر 21 کے لوگوں سے زیادہ ذہین تھے۔ انہوں نے اپنے جوتے رات ہی اٹھا کر سنبھال لیے تھے۔ کمرہ نمبر 27 کے باہر عام استعمال والی چپلیں پڑی تھیں۔ اب قسمت خراب ہو تو ذہانت کہاں کام آتی ہے۔ کمرہ نمبر 27 کے ایک جوان کو جاگنگ کا شوق تھا۔ اس نے کراچی کے کسی جمعہ بازار سے سیکنڈ ہینڈ adidas کے جاگرز خریدے تھے جن کی قیمت سن کر لگتا تھا کہ فرسٹ ہینڈ تو شاید شادی کے موقع پر دلہن والوں سے جہیز میں ہی مانگے جا سکیں گے۔ وہ جاگرز اب باہر پڑے تھے۔

یہی جاگرز بہت آہستگی سے کمرہ نمبر 7 کے ان دونوں لڑکوں کی زنبیل میں منتقل ہو گئے تھے۔ کمرہ نمبر 27 والوں کی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے کمرہ نمبر 21 والوں کو اسکریٹ فالو کر رہا تھا جس کی وجہ سے انہوں نے کمرہ نمبر 7 کے ایک اکاؤنٹ مکین سے پنگا لینے کی غلطی کی تھی۔

تینوں جوتوں کے جوڑے لے کر وہ لڑکے اسی طرح بے آواز چلتے واپس کمرہ نمبر 7 میں آگئے تھے۔ ان جوتوں کو ایک بڑے شاپنگ بیگ میں بند کر کے ایک سمت میں لگا دیا گیا تھا۔ پہلا مرحلہ مکمل ہو گیا تھا۔ دوسرا مرحلہ ٹھیک پینتالیس منٹ بعد شروع ہوا۔

کوریڈور کے آخر میں باتھ روم بنے ہوئے تھے۔ ہر انسان نے ہی عادت سی بنائی ہوئی تھی کہ انہیں کوئی مخصوص باتھ روم استعمال کرنا ہے۔ اس سے شاید ملکیت کی حس کو سکون ملتا تھا۔ اب کمرہ نمبر 7 کے دونوں مکینوں کا رخ ان ہی باتھ رومز کی طرف تھا۔ کمرہ نمبر 3 کے کل شیر کو صبح سویرے نہانے کی عادت تھی۔ جمعے کے روز وہ علی الصبح ہی فارغ ہو جاتا تھا کیونکہ جیسے جیسے ہاسٹل کے مکین بیدار ہونا شروع ہوتے تھے۔ باتھ رومز میں رش لگنے لگتا تھا پھر اپنی باری کے لیے ٹوکن لینے کی نوبت آ جاتی تھی' اسی لیے گل شیر یہ کام جلدی کر لیتا تھا۔ اس نے اپنے لیے جو واش روم منتخب کیا ہوا تھا۔ اتفاق سے اس کے اندر کپڑوں کو ٹانگنے کے لیے کوئی اسٹینڈ وغیرہ موجود نہیں تھا۔ گل شیر کو کپڑے باتھ روم کے دروازے پر لٹکانے پڑتے تھے جو پہنے ہوتے تھے وہ بھی اور جو پہننے ہوتے تھے وہ بھی۔ باتھ روم کے دروازے ایسے تھے کہ کوئی بھی باہر سے کپڑے آرام سے اٹھا کر لے جا سکتا تھا۔

کمرہ نمبر 7 کے دونوں مکین اسی باتھ روم کے باہر پہنچ گئے۔ جیسے ہی نلکا چلنے اور پانی گرنے کی آوازیں آنا شروع ہوئیں انہوں نے وہ سارے کپڑے آہستگی سے وہاں سے اٹھائے اور ہنسی دباتے اپنے کمرے میں آگئے۔

کمرہ نمبر 7 کے وہ دونوں لڑکے اپنے کمرے میں واپس آئے۔ گل شیر کے کپڑوں کو بھی شاپنگ بیگ میں ڈال دیا۔

"ٹھہر یار۔ یہ بھی اس میں رکھ دے۔" مرتضیٰ نے اپنے دونوں جوتے سعدی کو دیے۔ وہ نا سمجھی کے عالم میں اسے دیکھنے لگا۔

"رکھ دے یار۔" وہ مسکرا کر بولا۔ سعدی نے وہ جوتے بھی رکھ دیے۔ مرتضیٰ کچھ لمحے ایسے ہی کھڑا رہا پھر کچھ سوچ کر وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا مگر ایک لمحہ بعد ہی وہ واپس آگیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں جوتے کا ایک جوڑا اور تھا۔ ایک جوتا بھورا تھا جبکہ دوسرا سیاہ۔

"کیا کریں' مجبوری ہے۔ کبھی کبھی گیہوں کے ساتھ گھن کو پیسنا ہی پڑتا ہے۔"

اس نے وہ جوتے سعدی کو تھماتے ہوئے کہا تھا۔ سعدی نے وہ جوتے بھی شاپر میں رکھ دیے۔ اس شاپنگ بیگ کو انہوں نے اس خالی مرتبان میں رکھ دیا جو مرتضیٰ اپنے گاؤں سلانوالی سے بھرا ہوا لایا تھا۔ یہ مرتبان بھی وقاص چودھری نے خالی کیا تھا۔ جب مرتضیٰ گل شیر سے درگت بنوا رہا تھا تو پیچھے سے وقاص چودھری یہی کام کر رہا تھا۔ شاپنگ بیگ کو مرتبان میں رکھنے میں دقت ہوئی مگر انہوں نے کھینچ تان کر اسے مرتبان کے اندر منتقل کر ہی لیا تھا۔ اس کے بعد وہ مسرور اور شاداں اپنے بستر پر دراز ہو گئے۔

بارہ بجے سعدی کی آنکھ سب سے پہلے کھلی تھی۔ اس نے مرتضیٰ کو جھنجوڑ کر جگا دیا۔ مرتضیٰ نے اٹھ کر دروازہ کھولا تھا پھر وہ کوریڈور میں چلا کر بولا۔

اس کی آواز اتنی بلند ضرور تھی کہ ہمسائے سن لیتے۔ کمرہ نمبر 5 کا علی سب سے پہلے باہر آیا تھا اور اسے ہی جھٹکا لگا تھا۔

"علی بھائی! میرے جوتے تو نہیں دیکھے آپ نے۔ رات یہیں رکھے تھے؟"

وہ اس کے قریب جا کر نہایت پریشان لہجے میں بولا۔

سعدی کمرے سے باہر نہیں نکلا تھا کیونکہ اسے ہنسی بہت آرہی تھی۔ مرتضیٰ کی ایکٹنگ لاجواب تھی۔

"اوہ یار' تجھے کیا پتا... میرا تو خود ایک جوتا غائب ہے جب کہ دوسرا یہ پڑا ہوا ہے۔"

وہ کمرے کے باہر پڑے پائے دان پر رکھے براؤن جوتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا ان کے شور و غل سے کمرہ نمبر 8 کا اطہر بھی باہر آگیا تھا۔

"یار! میرا سیاہ رنگ کا ایک جوتا غائب ہے۔"

وہ بھی اجتماعی ماتم میں شامل ہو گیا۔ ایک گھنٹے کے اندر کمرہ نمبر 21 اور 27 کے لوگوں نے بھی انہیں جوائن کرلیا تھا۔ سب سے بُرا حال غفار کا تھا جس کے جاگرز غائب ہوئے تھے۔ وہ خود کو کوس رہا تھا کہ جاگنگ کے لیے کیوں نہ اٹھ سکا جب کہ سب سے اونچی آواز غلام مرتضیٰ بھٹی کی تھی جس کے سیل سے خریدے گئے بیس روپے والے پلاسٹک کے جوتے غائب تھے جب کہ وہ سب سے کہہ رہا تھا۔

"میرے بالکل نئے جوتے تھے۔ یہ سعدی سے پوچھ لے کوئی۔ کل اس کے ساتھ جا کر خریدے تھے۔ ہائے میرے جوتے۔"

سعدی اس قابل نہیں تھا کہ گواہی دے سکتا۔ اس کی ہنسی ہی بند نہیں ہو رہی تھی۔ سو وہ کمرے میں سوتا بن گیا تھا۔ اس سارے شور و غل میں ایک شخص الگ ہی راگ الاپ رہا تھا۔

"اوہ' کوئی میری فریاد کیوں نہیں سنتی۔ مجھے باہر نکالو۔ میں یہاں پھنس گئی ہے۔"

کسی کو آواز سنائی دیتی تو پتا چلتا کہ کون چلا رہا ہے اور کہاں سے چلا رہا ہے اس روز مرتضیٰ اور سعدی نے دوپہر کا کھانا ہاسٹل سے باہر کھایا تھا اور بہت ڈٹ کر کھایا تھا۔ جوتے اور کپڑے بیچ کر اتنے روپے تو مل ہی گئے تھے کہ وہ ٹھیک ٹھاک عیاشی کر سکتے۔ پورے ہاسٹل میں جوتوں کے لیے تلاشی لی گئی تھی لیکن جن لوگوں کے جوتے غائب تھے' ان کے کمروں کو چیک نہیں کیا گیا تھا حالانکہ چیک کر لیا جاتا تو ان کے مقدر میں یہ عیاشی نہ آتی۔

☆ ☆ ☆

آئیں کی بات ہے کہ بظاہر اس کی شخصیت بہت عام سی تھی۔ اوسط قد کاٹھ' اوسط رنگ و روپ' اوسط صحت اور اوسط ہی دولت' یعنی کل ملا کر وہ ایک درمیانہ سا شخص تھا۔

اگر زمین پر کوئی مقام اعراف ہوتا اور وہاں ٹھہرائے جانے کے لیے ظاہری شخصیت کو پرکھ کر فیصلہ کیا جاتا تو غلام مرتضیٰ بھٹی اسی مقام پر پایا جاتا۔ وہ ان لڑکوں میں سے تھا جنہیں لڑکیاں تب بھی گھاس نہیں ڈالتیں جب پتا ہو کہ یہ شوق سے کھائیں گے۔ البتہ لڑکوں کی ان سے خوب بنتی ہے۔ کیونکہ ان میں ازل سے رقیب بننے کا مادہ ہی نہیں ہوتا۔ مرتضیٰ میں بھی یہ خصوصیت بدرجہ اتم موجود تھی اس لیے اس کا حلقۂ یاراں شیطان کی آنت کی طرح لمبا ہو رہا تھا۔ کالج میں بہت زیادہ ڈسپلن کا مظاہرہ کرنے کی وجہ سے ہاسٹل آتے ہی سب کے نٹ بولٹ ڈھیلے ہو جاتے تھے اسی لیے خوب شرارتیں ہوتیں' وہ لڑکے جو کالج میں اساتذہ کے منظور نظر تھے۔ یا اسٹیفس کونشس تھے۔ وہ بھی ہاسٹل واپس آکر ایک مختلف روپ میں نظر آتے یہی وجہ ہے کہ یہاں کا ماحول زیادہ دوستانہ تھا۔ مرتضیٰ کے جوہر بھی چند دنوں میں کھل کر سامنے آگئے تھے۔

ابتدا میں نئی اور انوکھی نظر آنے والی چیزیں بہت جلد پرانی ہونے لگی تھیں۔ نئے لوگ پرانے لوگوں سے گھل مل گئے تھے۔ غلام مرتضیٰ بھٹی کے ہر انداز میں دیہاتی رنگ جھلکتا تھا مگر خود اعتمادی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی جو لاہور جیسے بڑے شہر میں اس کی بقا میں بالکل ایسے مدد کر رہی تھی جیسے گائیڈ بکس' ٹیکسٹ بکس کو رٹنے میں مدد کرتی ہیں۔

وہ جہاں سے آیا تھا وہاں وہ اندھوں میں کانا راجا تھا۔ جب کہ یہاں سب آنکھوں والوں میں سے وہ گنے چنے کانوں میں سے ایک تھا۔ مگر ہر گزرتا دن اس کی شخصیت کی ایسے قلعی کر رہا تھا جیسے تانبے کے برتنوں کی کی جاتی ہے۔ وہ چیزیں' جو ابتدا میں اسے خجالت میں مبتلا کرتے تھے اب انہیں تجلی کرنے میں اسے مزہ آنے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

"انا للہ وانا الیہ راجعون۔" کوئی اس کے گلے سے لگا اسے اس کے باپ کی موت کا دلاسا دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس شخص کے آنسوؤں سے اس کی سیاہ قمیص کا کندھا بھیگنے لگا تھا۔ وہ بمشکل خود کو اس سے علیحدہ کرکے ابھی اندر جانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ کسی اور نے آگے بڑھ کر اسے خود سے لپٹا لیا۔

یہ سب اس کے رشتہ دار تھے لیکن وہ ان میں سے بہت کم لوگوں کو جانتا تھا۔ اس نے کبھی ان سے ملنے یا بات چیت کرنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ وہ سب تو شاید زندگی میں پہلی مرتبہ اس سے گلے ملنے کا شرف حاصل کر رہے تھے۔ وہ ایک سے علیحدہ ہوتا تو کوئی دوسرا اس کے چہرے پر پھیلی ناگواری کو اس کا حزن و ملال سمجھتے ہوئے اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیتا۔

"صبر بیٹا صبر! یہی زندگی کا اصول ہے۔"

وہ اس شخص کے نام سے واقف تھا۔ ایک آدھ بار تصویر بھی دیکھ رکھی تھی۔ شاید اسی لیے اسے پہچان لیا۔ اسے حیرت ہوئی تھی کہ یہ شخص اس کے باپ کے حلقہ احباب میں کب اور کیسے شامل ہوا۔ فی الوقت وہ یہاں سے کچھ دیر کے لیے ہٹ جانا چاہتا تھا۔ وہ ان تسلیوں اور دلاسوں کو کسی کے ساتھ بانٹنا چاہتا تھا، لیکن اس نے آج تک کسی کے ساتھ کچھ بھی نہیں بانٹا تھا۔ شاید اسی لیے اس کی جھنجلاہٹ میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ اسے اپنے ساتھ گزارنے کے لیے کچھ لمحے درکار تھے تاکہ وہ سود و زیاں کا حساب کر سکے مگر ساری زندگی اپنی مرضی کے مطابق گزارنے کے باوجود اسے فی الحال ایک لمحہ نہیں مل پا رہا تھا۔

اسی دوران مین گیٹ سے دیہاتی رشتہ داروں کی ایک نئی کھیپ اندر داخل ہوئی تھی۔ اب اس کی ناگواری چھپائے نہ چھپ سکی۔ اس نے زچ ہو کر سر جھکا لیا۔ اسے ایک بار پھر آنکھوں میں نمی اترتی محسوس ہوئی۔

"بیٹا! اپنے کمرے میں جاؤ۔ کب سے یہاں بیٹھے ہو۔ تھک گئے ہو۔ بہت ذمہ داریاں سنبھالنی ہیں تمہیں۔ کچھ دیر ریسٹ کر لو۔"

انکل صدیق اس کی مشکل سمجھ کر اس کی مدد کے لیے آگے بڑھے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی کچھ اور لوگ بھی ان کی بات کی تائید کرنے لگے۔ وہ فوراً "جان چھڑا کر" بھاگنے والے انداز میں لابی کے دروازے کی سمت بڑھا۔ چند قدم چل کر ہی اسے اپنا سانس پھولا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ قابل رشک صحت کا مالک تھا۔ اسے اپنا خیال رکھنے کا شوق بھی بہت تھا، لیکن ایک رات نے گویا اس کی ساری توانائیاں چھین لی تھیں۔ اس نے اپنے آپ کو کبھی اتنا تھکا ہوا محسوس نہیں کیا تھا۔ لابی سے ہو کر وہ لاؤنج میں داخل ہوا۔ جہاں رشتہ دار خواتین بے ترتیب حالت میں

بکھری پڑی تھیں۔ وہ ان پر ایک نگاہ ڈال کر فوراً "ماسٹر بیڈ روم کی جانب بڑھ گیا۔

بیڈ روم میں داخل ہو کر اس نے قمیص اتار کر بیڈ پر پھینک دی۔ اور اے سی آن کر کے اس کے بالکل سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کی سفید بنیان پسینے سے شرابور تھی۔ چند لمحے اسی طرح اے سی کے سامنے کھڑا گہرے سانس بھرتا رہا۔

کمرے کا گرم ماحول تیزی سے خنک ہونا شروع ہوا تھا۔ اسے چند لمحوں کے لیے واقعی بہت سکون محسوس ہوا۔ اے سی کے سامنے سے ہٹ کر وہ بستر پر دراز ہو گیا۔ اس کی ٹانگیں بیڈ سے نیچے لٹک رہی تھیں۔ وہ کافی دیر تک اسی پوزیشن میں پڑا رہا۔ پسینہ خشک ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے حواس بھی بحال ہو رہے تھے۔

وہ جس حالت میں لیٹا تھا اس کے بالکل سامنے ڈرائنگ روم سے ملحقہ دیوار تھی۔ اس کی ٹانگیں تقریباً" اسی سمت میں تھیں۔ اسے یکدم یاد آیا کہ اس کا باپ اس کے اس طرح سے لیٹنے پر بہت غصہ کرتا تھا۔

"اس طرف کعبہ شریف ہے، تمہاری ماں اس سمت رخ کر کے نماز پڑھتی ہے۔"

وہ اسے اس طرح لیٹے دیکھ کر ہمیشہ ٹوکتا تھا اور وہ بڑبڑاتے ہوئے اس کمرے سے چلا جایا کرتا۔ یہ کمرہ اس کے باپ کا بیڈ روم تھا۔ اس کا بیڈ روم بھی ساتھ ہی تھا۔ اس کے ماں باپ جب اس کمرے میں باتیں کرتے تھے تو ملحقہ کمرے میں اسے ان کی باتیں واضح سنائی دیا کرتی تھیں۔ اس انداز میں لیٹے لیٹے اس کے جی میں جانے کیا سمائی کہ اس نے لیٹے لیٹے ہی رخ تبدیل کر لیا۔ اب اس کی ٹانگیں شمال کی جانب تھیں باپ کی زندگی میں وہ ہر چیز سے اختلاف کیا کرتا تھا جو اس کا باپ اسے کہتا اور اگر آج وہ اسے اس طرح سے رخ بدلتا دیکھ لیتا تو آگے بڑھ کر اس کی پیشانی چوم لیتا۔ اس نے بے وجہ آنکھیں جھپکیں اور ماتھے پر دو انگلیاں پھیرنے لگا۔ وہ لمس جس سے وہ ساری زندگی جھنجلاتا رہا تھا اسی لمس کی خواہش نے اس کے وجود کو ہلا رکھ دیا تھا۔ یہ خواہش ایسی منہ زور تھی کہ وہ "وات ربش" کہہ کر اسے جھٹک بھی نہیں پا رہا تھا۔

اسے اپنے آرٹسٹک ذہن پہ بہت ناز تھا۔ ہر کمرے کے اینیمل ڈیکوریشنز و فلورل ماربل ٹائلز سے لے کر ڈرائنگ روم ایسیسریز تک ہر چیز اس نے خود پسند کی تھی۔

جو دیوار اس کی نظروں کے سامنے تھی اس پر گل جی کے ہاتھ کا ایک بہت خوبصورت آرٹ پیس آویزاں تھا۔ خطاطی کا یہ شاندار نمونہ جو سورہ رحمن کی آیت پر مشتمل تھا۔ یہ اس کمرے کی واحد چیز تھی جو اس کے باپ نے اپنی مرضی سے یہاں لگائی تھی۔

اس کے باپ کو کہیں سے گل جی کی بنائی ہوئی پینٹنگز والا ایک جرنل ملا تھا جس کے ایک بھورے پیج کو انلارج کر کے اس کے باپ نے کہیں سے پرنٹ آؤٹ نکلوایا تھا پھر اسے بے حد شاندار سنہری فریم کروا کر دیوار پہ آویزاں کیا گیا تھا۔ اس کے باپ کے ذہن کی رسائی یہاں تک کیسے ہوئی یہ سوال تو اکثر اسے تعجب میں ڈال دیتا تھا۔ وہ آیت جو اس آرٹ پیس میں جگمگا رہی تھی اس آیت کے متعلق اس کا باپ اسے اکثر کچھ قصے سنانے کی کوشش کرتا تو وہ مذاق میں بات کو ٹال دیتا تھا۔ اسے اس کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی نظرانداز کرنے میں بہت مزہ آتا تھا۔ اس نے آیت کے ترجمے کو پڑھنے کی کوشش کی۔

"اور تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔"

اس نے دو تین بار خالی الذہنی کی کیفیت میں ان الفاظ کو دہرایا۔ اسے محسوس ہوا اس کے دل میں جھکڑ سے چل رہے ہیں۔ قبل اس کے کہ وہ کچھ سوچتا اس کے موبائل کی بیپ بجنے لگی۔ اس کا موبائل اس کی قمیص کی جیب میں تھا جو اس نے اتار کر بیڈ پر پھینک دی تھی۔ وہیں لیٹے لیٹے اس نے قمیص کو اپنی جانب گھسیٹا اور اس میں سے سیل فون نکالنے لگا۔

اس کی ننھی اسکرین پر "ارحم کالنگ" کے الفاظ دیکھ کر وہ شاید زندگی میں پہلی بار تذبذب میں گھر گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آیا اسے کال ریسیو کرنی چاہیے یا نہیں۔ کچھ لمحے سوچنے کے بعد اس نے کال ریسیو کر لی تھی۔

"ارحم! میرے ڈیڈ مر گئے۔"

اس نے ارحم کی بات سنے بغیر کہا تھا۔ اسے خود لفظ "ڈیڈ" پہ حیرت ہوئی۔ اس نے پہلے کبھی اپنے باپ کے لیے یہ لفظ استعمال نہیں کیا تھا۔ ارحم چند لمحے کے لیے خاموش رہ گیا تھا۔

"آر یو شیور؟" ارحم کی مدہوش آواز سنائی دی تھی۔ وہ اس وقت بھی نشے کی حالت میں تھا۔

"پریشان نہ ہو یار۔۔۔! میرا باپ ہر رات کسی نہ کسی کتیا پر مرتا ہے۔۔۔ میں تو کبھی پریشان نہیں ہوا۔ الٹس اے پارٹ آف لائف۔۔۔ مرنے دو۔"

وہ رک رک کر یوں رہا تھا۔ وہ واقعی نشے میں تھا۔ وہ جب نشے میں نہیں ہوتا تھا تو اپنے باپ کے لیے اس سے زیادہ گندے الفاظ استعمال کرتا تھا۔ اس نے کال منقطع کر دی۔

وہ اس کمرے میں سکون کی خاطر آیا تھا مگر یہاں آکر بھی اس کی جھنجلاہٹ لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی۔ اس کمرے میں اس شخص کی یادیں ماتم کناں تھیں جو اس کا باپ تھا۔ اس نے اپنے باپ کی محبت کو ہمیشہ پرائز بانڈ میں نکلا انعام سمجھ کر استعمال کیا تھا۔ انعام میں نکلی رقم جتنی مرضی خرچ کی جائے بالآخر اسے ختم ہونا ہوتا ہے۔ اس کا باپ بھی ختم ہو چکا تھا۔ افسوس ناک بات یہ تھی کہ پرائز بانڈ خریدا جا سکتا ہے۔ مگر باپ خریدنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا۔ سو وہ حالت افسوس میں تھا۔ اسے خبر بھی نہیں تھی کہ زندگی کتنی تیزی سے اپنے لبادے اتار کر اپنی برہنہ حقیقتیں اس کے سامنے رکھ رہی ہے۔

☆ ☆ ☆

"یار! تم لائٹ بند کر کے کیوں نہیں سوتے؟" وہ چڑ کر بولا۔

کب سے تکیہ آنکھوں پر رکھے سونے کی کوشش کر رہا تھا مگر ٹیوب لائٹ کی روشنی سونے نہیں دے رہی تھی۔ کالج میں پڑھائی زوروں پر تھی اور وہ بہت ذہین نہیں تھا۔ اس لیے اسے کافی محنت کرنا پڑتی تھی اور اس چیز کا وہ عادی تھا۔ محنت کے ساتھ سحر خیزی اس کی دیہاتی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ یہاں پر انتظام ذرا الٹ تھا۔ سب ہی لڑکے تاخیر سے سوتے تھے اور تاخیر سے بیدار ہوتے تھے۔

"سونے کے لیے لائٹ نہیں، آنکھیں بند کرنا ضروری ہوتا ہے بچے۔" سعدی کی آواز میں قطعیت تھی۔ وہ چت لیٹا تھا۔ سر کے نیچے تکیے کے علاوہ دو سافٹ کشن بھی رکھ رکھے تھے جس کی وجہ سے وہ خود بھی صوفہ کم بیڈ تک رہا تھا۔

"تمہیں ہوا کیا ہے۔۔۔ تم سوتے کیوں نہیں؟" مرتضیٰ جھنجلا کر اٹھ بیٹھا۔

"مجھے لگتا ہے مجھے عشق ہو گیا ہے۔ میں اختر شماری کی کوشش کر رہا ہوں۔" وہ چھت کو تکتے ہوئے بولا تھا۔

"یہ ذلیل کام تم کمرے سے باہر جا کر کیوں نہیں کرتے؟" اس نے تپائی پر پڑا گلاس کھینچ کر اسے مارا جسے سعدی نے کیچ کر لیا۔

"میں ہوں ذرا مختلف مزاج کا آدمی۔ مجھے انوکھے کام کرنا اچھا لگتا ہے۔ اس لیے میں کمرے میں رہ کر اختر شماری کر رہا ہوں۔"

اس کے انداز میں لاپروائی کا عنصر نمایاں تھا

"اچھا تو کتنے اختر گن لیے؟" وہ زچ ہو کر بولا۔

"افسوس... صرف ایک۔ ہاسٹل میس کا کلرک۔ اختر عباس۔"

اس کے لہجے میں افسوس گھلا ہوا تھا۔

"اختر عباس!" مرتضیٰ نے دہرایا۔ اس کے لہجے میں کڑواہٹ تھی۔ اختر عباس کسی کو بھی پسند نہیں تھا۔ سب اسے الٹے سیدھے مختلف ناموں سے پکارتے تھے۔ سعدی اسے "چپلی کباب" کہتا تھا۔

"میری بات مانو مسٹر سعدی! اختر شماری چھوڑ کر دختر شماری شروع کرو۔ ایک ہاتھ نبض پر رکھو' دوسرے ہاتھ کو بازو کے ساتھ نثار رہنے دو۔ اور پھر ایک ایک کر کے اردگرد رہنے والوں کی دختران نیک اختروں کو یاد کرنا شروع کرو جس دختر کے نام پر دل کی دھڑکن اور نبض ایک ساتھ دوڑیں کل صبح اسی کو پرپوز کردو۔ صبح ہونے میں بارہ گھنٹے ہیں۔ اس لیے ابھی سو مر جاؤ۔ اس منحوس ٹیوب لائٹ کو بھی سونے دو اور مجھ معصوم پر بھی رحم کرو۔"

"ابھی صرف ساڑھے آٹھ ہوئے ہیں۔ مجھے نیند نہیں آرہی یار...! اتنی جلدی کیسے سو جاؤں۔" وہ بے بسی سے بولا تھا۔

"میرا کل مطالعہ پاکستان کا ٹیسٹ ہے... میں نے کچھ یاد نہیں کیا۔ سوچا تھا صبح اٹھ کر یاد کر لوں گا۔"

مرتضیٰ اٹھ کر بیٹھ گیا اور بالوں میں انگلیاں چلانے لگا۔

"مطالعہ پاکستان بھی بھلا یاد کرنے والا مضمون ہے۔ دو قومی نظریہ' چودہ نکات' قرار داد مقاصد' مسئلہ کشمیر اور خارجہ پالیسی' یہ سب میں نے 8th اسٹینڈرڈ میں یاد کیے تھے۔ اب تک اسی کے سہارے پاس ہو جاتا ہوں اور مارکس بھی کبھی نائنٹی پرسنٹ سے کم نہیں آئے۔"

مرتضیٰ ہی کے انداز میں بیٹھ کر مونچھوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے وہ اپنے متعلق بتانے لگا۔ مرتضیٰ نے خود اس کے ساتھ ملانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ جانتا تھا سعدی ایک آؤٹ اسٹینڈنگ اسٹوڈنٹ ہے۔ وہ جس چیز کے لیے بہت پریشان ہوتا تھا سعدی کو اسی چیز پر دسترس حاصل تھی۔ بلکہ وہ کمبخت چیز یعنی انگریزی اس کا پسندیدہ مضمون تھا۔ سعدی کے بارے میں سوچتے سوچتے اس کا دھیان اپنے گاؤں کی سمت چلا گیا۔ وہاں وہ اچھا خاصا پڑھا لکھا لڑکا تھا لیکن یہاں آکر اپنے اردگرد بسنے والے ذہین و فطین لوگوں کو دیکھ کر اسے احساس ہوا تھا کہ آگے بڑھنے کے لیے اسے زیادہ سے زیادہ محنت کی ضرورت ہے۔

اسے ایک دم سے اماں جی کی یاد آگئی۔ جو یہ سمجھتی تھیں کہ ان کے بیٹے سے زیادہ کوئی پڑھتا ہی نہیں ہوگا۔ ایک بار وہ ہائی اسکول کی لائبریری سے بہت منت سماجت کر کے انگلش کی ڈکشنری لے آیا تھا۔ اماں جی اور ابا جی اس ڈکشنری کو ہاتھ میں لے کر تولتے اور ہولتے رہتے تھے۔

"اتنی وزنی پڑھائی توبہ توبہ...!" توبہ استغفار کرتے رہنا اماں جی کا من پسند مشغلہ تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" سعدی نے اس کی محویت کو توڑا۔

"یاد کر رہا ہوں۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"کسے؟" سعدی نے چونک کر پوچھا۔ انداز میں اشتیاق بھی تھا۔

"اماں جی کو۔" مرتضیٰ کے چہرے پر مسکراہٹ کی پرچھائیں گہری ہوئی۔

"وحشت تیرے کی۔ میں تم سے عشق و عاشقی کی باتیں کر رہا ہوں اور تم اماں جی کو یاد کرنے لگے۔ اس سے بہتر ہے بندہ کامن روم میں جا کر ٹی وی دیکھ لے۔" وہ چارپائی سے ٹانگیں لٹکا کر چپلیں پہننے لگا۔

"میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" وہ بھی فوراً چپل پہن کر ساتھ ہو لیا۔

کوریڈورز میں اتنی گہما گہمی نہیں تھی۔ ابھی زیادہ ٹائم بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ دونوں کامن روم کی طرف بڑھنے لگے۔ مرتضیٰ کے دل میں جانے کیا آئی کہ چلتے چلتے ایک کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ اس نے بہت آہستگی سے یہ کام کیا تاکہ اندر موجود رضوان کو احساس نہ ہو کہ وہ قید کیا جا چکا ہے۔ رضوان اسی کا کلاس میٹ تھا اور کافی خوش مزاج لڑکا تھا۔

دروازے کی کنڈی لگا کر وہ سیدھا ہی ہوا تھا کہ آواز آئی۔

"لاک بھی لگا دو۔"

"نہیں یار! رضوان غصہ کرے گا۔ میں نے اس سے انگریزی کے نوٹس لینے ہیں۔" اس نے اپنی طرف سے سعدی کو جواب دیا تھا۔ مگر جب غور سے دیکھا تو چہرے پر کھسیانی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"وہ... میں دیکھ رہا تھا۔ کنڈی خراب تو نہیں ہے۔" کھسیاہٹ چھپانے کو کچھ تو کہنا ہی تھا۔ رضوان نے زور دار قہقہہ لگایا۔ وہ ایسے خوش ہو رہا تھا جیسے کسی چور کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہو۔

"اچھی طرح سے دیکھ لے لالے! ڈرنے کی کیا بات ہے۔ میں یہاں تیری حفاظت کے لیے ہی کھڑا ہوں۔" وہ اس کا کندھا تھپتھپا کر بولا۔ مرتضیٰ بھی خجالت سے ہنس دیا۔

"اس شرارت سے انگریزی کے نوٹس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ سمجھے۔" رضوان ہنستا رہا پھر اسے کمرے کے اندر آنے کی دعوت دی۔

"نہیں یار! میں اور سعدی ذرا کامن روم میں جا رہے تھے۔ میں ادھر رک گیا یہ سعدی کہاں گیا؟"

اسے اچانک احساس ہوا تھا کہ سعدی منظر سے غائب ہے۔

"وہ کامن روم میں چلا گیا ہوگا۔ وہ تو بہت مغرور بندہ ہے بھئی!" رضوان نے وہی رائے دی جو تھرڈ ایئر کے اکثر طالب علم سعدی کے بارے میں دیتے تھے۔ وہ رضوان کو ٹال کر کامن روم کی طرف آ گیا۔ وہاں خوب رش لگا ہوا تھا۔ ٹی وی پر آٹھ بجے کا ڈرامہ دیکھنا بہت سے لڑکوں کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ مرتضیٰ کو ٹی وی دیکھنے کا شوق تو بہت تھا مگر وہ کمرے میں رہ کر سعدی کے ریڈیو سے ہی بہلا لیتا تھا۔ سعدی کامن روم میں اپنے فورتھ ایئر کے گروپ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ مرتضیٰ' طلحہ وغیرہ کے ساتھ براجمان ہو گیا۔ سب انتہائی خشوع و خضوع سے ٹی وی کی جانب دیکھ رہے تھے۔

"سب کے سب آٹھ بجے سے نو بجے تک نماز ڈرامہ ادا کرتے ہیں۔ اللہ انہیں معاف کرے اور مجھے بھی۔ جماعت کی امامت تو میں ہی کرتا ہوں۔" طلحہ نے اس کے بیٹھتے ہی چٹکلا چھوڑا۔

"کرن کہانی سُپر کاسٹ ہو رہا ہے۔" دوسری طرف بیٹھے عاطف نے خوشی سے بھرپور لہجے میں بتایا۔ سارا زور کرن کہانی کے بجائے صرف "کرن" پر تھا۔

"کرن کو کیا ہو رہا ہے؟" پیچھے سے راشد جو شاید ابھی ابھی آیا تھا' تڑپ کر پوچھنے لگا۔

"کرن سب کے خوابوں کی ملکہ ہے۔" اس بار بھی طلحہ نے معلومات بہم پہنچائی تھیں۔

اشارہ ڈرامہ کے مرکزی کردار کی جانب تھا۔ جس کا نام مرتضیٰ کو نہیں پتا تھا۔

"یارو! کرن کو اتنے غور سے نہ دیکھا کرو۔ یہ تمہاری ہونے والی بھابھی ہے۔"

یہ آواز کامن روم کے ایک کونے سے آئی تھی۔ وقفہ ہو چکا تھا اور ٹی وی پر لب اشتہار دکھائے جا رہے تھے۔

"کتنے برسوں تو نے بشریٰ انصاری کو ہماری بھابھی بنا دیا تھا۔ آج روحی بانو ہماری بھابھی بن گئی۔ کل بابرہ شریف پر بھی قبضہ کر لے گا۔"

یہ شکوہ بھی باآواز بلند پیچھے سے آیا تھا۔ پچھلی طرف فورتھ ایئر کے لڑکے بیٹھے تھے۔

"ایک کی گنجائش پھر بھی باقی ہے۔ اسلام میں چار کی اجازت ہوتی ہے نا۔"

"فورتھ ایئر کا ایک اور لڑکا بولا تھا۔ کامن روم کشت زعفران بن گیا تھا۔

"نرا نقصان کا سودا ہے۔ ہم نہیں کھیلتے۔ سارے اچھے مال پر تو فورتھ ایئر نے قبضہ کر لیا ہے۔"

اس بار بار طلحہ نے اعتراض کیا۔

"لڑو نہیں بیٹا! ٹاس کر لو۔ مال غنیمت میں بزرگوں کا خیال ضرور رکھنا۔"

یہ فورتھ ایئر کا وہی لڑکا تھا جس نے شکوہ کرنے میں پہل کی تھی۔ اسی دوران وقفہ ختم ہوا اور ڈرامہ دوبارہ شروع ہو گیا۔

"ش... ش... ش... اب کوئی نہیں بولے گا۔" ڈرامہ شروع ہوتے ہی سب باری باری سب کو تلقین کرنے لگے۔

مرتضیٰ نے پہلے بھی اس سیریل کی کچھ قسطیں دیکھ رکھی تھیں۔ اسے بھی اس میں بہت دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ ڈرامے کا ہیرو بھی اسکرین پر نمودار ہو چکا تھا۔

"یہ ہیرو ہے؟" اس نے اسکرین پر نظر آنے والے لمبے دبلے پتلے لڑکے کو دیکھتے ہوئے طلحہ سے پوچھا۔
"کون کا ہیرو تو ان شاء اللہ میں بنوں گا۔۔۔۔ طلحہ نیازی۔۔۔ بی اے ایل ایل بی۔ یہ جاوید شیخ ہے۔"
طلحہ نے بہت آہستگی سے کہا تھا اور پیچھے بیٹھے لڑکے سے ایک کرارا مکا کھایا تھا۔ آواز ذرا سی بھی بلند ہوتی تھی تو پیچھے بیٹھے لڑکے تھپڑ اور مکے مارنا شروع کر دیتے تھے۔ سب کی توجہ اسکرین کی جانب تھی۔ جاوید شیخ کی روحی بانو کے ساتھ مزے مزے کی اٹھکیلیاں شروع ہو چکی تھیں۔ کامن روم میں بیٹھا ہر لڑکا خود کو جاوید شیخ اور روحی بانو کو اپنی سب کی پسند بھی سمجھ رہا تھا کہ یکدم بجلی چلی گئی۔
"ہائے۔۔۔ ہائے۔۔۔ مارے گئے۔۔۔ او ہو۔۔۔ بیڑا غرق"
جیسی آوازیں چاروں طرف سے بلند ہوئی تھیں۔ اچھی خاصی ہاہاکار مچ گئی تھی۔ پھر کسی نے اٹھ کر سوئی گیس سے جلنے والے لیمپ روشن کر دیے۔ لڑکے اٹھ کر باہر جانے لگے۔ جن کی امید ابھی عالم نزع میں تھی وہ وہیں بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔ مرتضیٰ کے دل میں نجانے کیا سمائی کہ وہیں بیٹھے بیٹھے روحی بانو کی نقل اتارنے لگا۔ وہ وہی ڈائیلاگ بول رہا تھا جو چند لمحے پہلے "کرن" ٹی وی اسکرین پر بول رہی تھی۔ سناٹا تھا سو آواز کی گونج بھی زیادہ تھی۔
"یہ کون بولا؟" کسی نے پوچھا۔
"سلاتوال کے پہلوان۔" طلحہ، مرتضیٰ کی پشت تھپتھپاتے ہوئے سراہنے والے انداز میں بولا۔
"واقعی؟" کئی چلی آوازیں آئی تھیں۔
"یار۔۔۔ پھر کر کے دکھاؤ۔" اب کی بار فرمائش آئی۔ مرتضیٰ جھینپا ضرور مگر پھر دوبارہ سے ویسی ہی نقل کرنے لگا جیسے پہلے کی تھی۔
"جاوید شیخ کی نقل کر دو یار۔۔۔ اچھا بھی جان کو بخش دو۔" طلحہ کا انداز شرارتی تھا۔
"مرتضیٰ کو جاوید شیخ کے ڈائیلاگ یاد نہیں تھے مگر انداز زبردست تھا اس لیے لیمپ کی روشنی میں وہ وہاں موجود لڑکوں کو رونق اور رقت کے علاوہ جاوید شیخ ہی لگا تھا۔
"اس سے کو ہیڈ کلرک انیس صاحب کی کاپی کر کے دکھاؤ۔ بہت زبردست کرتا ہے۔" سعدی نے پہلی بار اس ساری گفتگو میں حصہ لیا تھا۔ مرتضیٰ نے ایک دفعہ کسی بات پر غصے میں آ کر اسے انیس صاحب کی نقل کر کے دکھائی تھی۔ پر زور فرمائش پر اسے کامن روم میں کرنا پڑا۔ سب نے تالیاں بجا کر داد دی تھی۔
"واہ یار! تم تو چھپے رستم نکلے۔ کمال زبردست۔۔۔"
ہر طرف سے آوازیں آ رہی تھیں۔ مرتضیٰ پذیرائی پر بے حد دل میں بہت خوش ہوا تھا۔ اسے احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ کسی کی نقل کرنا اتنا دلچسپ ہو سکتا ہے۔ اس دن کے بعد سے اس کے دوستوں کے ہاتھ میں یہی مشغلہ آ گیا تھا۔ وہ سب جب بھی فراغت میں بیٹھتے۔ اس سے یہی فرمائش کی جاتی کہ "کسی کی نقل کر کے دکھاؤ۔"

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر جو تھا راز داں اپنا

سعدی نے لہک کر شعر مکمل کیا اور داد طلب نظروں سے مرتضیٰ کی جانب دیکھنے لگا۔ جس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔
"یہ شعر تمہارا اپنا ہے؟" اس نے پوچھا۔
"ہاں۔۔۔"
"تم نے خود لکھا ہے۔" مرتضیٰ نے گھور کر پوچھا تھا۔
"ہاں۔" سابقہ بے نیازی سے جواب دیا گیا۔
"لیکن۔۔۔ یہ تو غالب کا ہے۔" مرتضیٰ اس کے پر یقین لہجے سے دھوکا کھا گیا تھا مگر یقین نہیں آ رہا تھا کیونکہ اس نے یہ شعر پہلے کہیں پڑھ رکھا تھا۔ سعدی نے اس بات پر حیرانی سے اسے دیکھا پھر ڈھٹائی سے بولا۔
"میں غالب کو غیر نہیں سمجھتا۔ وہ بندہ پرور بھی ہے۔"
"تم نے کہا تھا تم نے خود لکھا ہے۔" وہ دوبارہ کتاب پر نظریں جما کر بولا۔
"قسم سے میں نے خود لکھا ہے۔ غالب کا دیوان اور اپنے ہاتھوں سے غالب کی کئی غزلوں کو لکھ لیا۔"
وہ اب بھی شرمندہ نہیں تھا۔ مرتضیٰ بغیر بولے کتاب کی جانب متوجہ تھا۔ اس کا پوسٹری کا ٹیسٹ تھا۔ سعدی کافی ذہین اسٹوڈنٹ تھا۔ مگر اسے پڑھنے کے لیے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑتی تھی۔ یا کم از کم مرتضیٰ نے اسے کتابی کیڑے کی طرح کبھی پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ بہترین اسکواش پلیئر اور سوئمنگ کا چیمپئن تھا۔ لکھانے سے بھی شغف تھا۔ اور انگریزی بھی کمال کی

تھا۔ کالج میں اس کی کافی دھوم تھی۔ مرتضیٰ نے کالج میں ... سے سنا تھا کہ سعدی کی انظر ویل آف آمرہ ہے۔ ... سعدی اپنے منہ سے اپنے بارے میں بہت کم بات کرتا تھا۔ کالج میں اس کی واہ واہ تھی تو ہاسٹل میں اس کو پسند کرنے والے بھی بہت تھے۔ مرتضیٰ کو اس بات سے ... نہیں تھی کیونکہ سعدی اس پر بہت مہربان تھا۔ اس نے ... اسے بڑا بھائی بن کر بہت ساری باتوں کی اچھائی برائی کے متعلق بتایا تھا۔ اس بات سے انکار نہیں کہ اس ... مزاج میں بے نیازی تھی۔ جو دوسروں کو نخرہ اور غرور محسوس ہوتا تھا مگر مرتضیٰ اس چیز کو ہنس کھیل کر برداشت کرتا تھا۔ اسے لگتا تھا یہ بے نیازی سعدی کا حق ہے ... یہ اس پر جچتی بھی تھی۔
"کس سوچ میں گم ہو؟" سعدی نے اسے کھویا ہوا دیکھ کر پوچھا۔
"پڑھ رہا ہوں۔ ٹیسٹ ہے کل۔" کتاب کی جانب دیکھتے ہوئے اس نے سادہ سے لہجے میں جواب دیا۔ اسے یہ ... نہیں سکتا تھا کہ تمہارے بارے میں سوچ رہا ہوں اور رشک کر رہا ہوں۔
"میری مدد کی ضرورت تو نہیں؟" سعدی نے پیشکش کی۔ وہ چارپائی پر لیٹا تھا۔
مرتضیٰ نے اس کی جانب دیکھا پھر مسکرا کر نفی میں سر ہلایا۔ وہ دل سے اس بندے کے خلوص کی قدر کرتا تھا۔
"میں ذرا باہر سے ہو کر آتا ہوں۔" سعدی نے چارپائی سے اترتے ہوئے بولا۔
"ان کو بھی اپنے تازہ اشعار سنا کر آتا ہوں۔" اب وہ سلیپرز پہن رہا تھا۔
"لازمی تو نہیں یار کہ غالب کو سب نے ہی پڑھ رکھا ہو۔" دروازہ کھلنے سے پہلے مرتضیٰ نے سعدی کو ہنس کر کہتے سنا تھا پھر وہ باہر نکل گیا۔ ہاسٹل میں چند ... تھے جن کی سعدی سے خوب بنتی تھی۔ ... خوش قسمت لڑکوں میں سے ایک تھا۔
اکتوبر کے بعد نومبر آ پہنچا۔ موسم کی تبدیلی زندگی کے معمولات پر معمول کی طرح اثر انداز ہونا شروع ہوئی۔ چونکہ لڑکیاں نہیں تھے اس لیے گرم شالیں اور کپڑے وغیرہ نکالنے میں جلدی نہیں مچائی گئی تھی۔ مگر پنکھے بند ہو گئے تھے۔ سونے جاگنے اور اٹھنے بیٹھنے کے معمولات میں خاطر خواہ تبدیلی واقع ہوئی تھی۔ گرمیوں میں دوپہر سے شام گئے تک سب سوتے رہتے تھے۔ اب چونکہ شام کو خود سونے کی جلدی ہوتی تھی اس لیے شام کی نیند اکثر لوگوں نے ترک کر دی تھی یا پھر بہت کم کر دیا تھا۔
سردی کے آتے ہی شام کی طبیعت میں خنکی اور اداسی کا عنصر بڑھ گیا تھا۔ کالج میں پڑھائی کی مصروفیات بھی ٹھیک ٹھاک تھیں، لیکن پھر بھی ایک چھٹی کر کے مرتضیٰ گاؤں کا چکر لگا آیا تھا۔
سردیوں کے کپڑے، مخصوص سوغاتیں اور روپیہ اس کے پاس گاؤں جانے کے بہت سے جواز تھے۔ ایک دن بعد ہی وہ واپس آ گیا تھا۔ اس لیے نہیں کہ اس کا گاؤں میں دل نہیں لگا تھا۔ بلکہ اس لیے کہ اسے لگا وہ ایک دن سے زیادہ یہاں رہا تو یہاں سے کبھی واپس نہیں جا سکے گا۔ اماں جی اس کے لیے اتنے اداس تھے کہ ایک لمحے کے لیے بھی اسے اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ اسی لیے اسے خدشہ لاحق ہوا کہ یہ جذباتی بلیک میلنگ اس کے ارادے میں دراڑیں ڈال دے۔ سو آنے کو تو وہ گاؤں سے آ گیا تھا مگر پھر بہت دن اداس رہا۔
ایسی ہی ایک خنک اداس شام میں سعدی کی تازہ غزلیں سن کر وہ باتھ روم جانے کا بہانہ کر کے کمرے سے نکل آیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ ذرا باہر کا چکر لگا کے یا کسی اور کے کمرے میں بیٹھ کر گپ شپ لگا لے۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر فرسٹ فلور پر آ گیا۔ سردی کی وجہ سے سب کے کمروں کے دروازے بند تھے۔ وہ کوریڈور میں چہل قدمی کر رہا تھا جب عقب میں کسی کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔
"کہاں جا رہے ہو؟" اس نے مڑ کر دیکھا۔ رمیز اپنے کمرے کے باہر کھڑا پوچھ رہا تھا۔
"جاپان!" وہ منہ لٹکا کر بولا۔ رمیز اسی کا کلاس فیلو تھا۔
"اچھا فیصلہ ہے۔ تمہارے جیسے بونے کو وہیں ہونا چاہیے تھا۔" اتنا کہہ کر رمیز نے کھٹک سے دروازہ بند کر لیا۔ اس کا قد کافی اونچا تھا اور وہ مرتضیٰ کو اکثر مذاق میں بونا کہتا تھا۔
طلحہ کے اس طرح کہنے پر کچھ لمحے اسی طرح کھڑا سوچتا رہا پھر واپس مڑ کر دستک دے کر انتظار کیے بنا دروازہ کھول کر منہ ڈالا اور تڑپ کر بولا۔
"ویون رچرڈز کے ماموں زاد بھائی! تمہیں بھی ویسٹ انڈیز میں ہونا چاہیے تھا۔"

"میری معلومات میں اس گرانقدر اضافے کے لیے شکریہ۔ توقیر صاحب نے معاشیات کا ٹیسٹ نہ لینا ہوتا تو پہلی فلائٹ سے ویسٹ انڈیز چلا جاتا۔ ویسے ٹھنڈ پڑ گئی بدلہ لے کر۔؟"

اسی دوران ناصر بھی آ گیا تھا۔ رمیز اور ناصر شام میں کچھ بچوں کو ہوم ٹیوشن دیتے تھے' اسی لیے انہیں جانا تھا۔ مرتضیٰ بھی ان کے ساتھ ہی اٹھ کر باہر آ گیا۔ اقبال ہاسٹل کے لان میں بھی خوب رونق رہتی تھی۔ اس نے گھاس پر کھلے لان میں تھرڈ ایئر کے کچھ اسٹوڈنٹس کو بیٹھے دیکھا' وہ ان کی طرف آ گیا۔ وہ سب دائرہ بنا کر بیٹھے تھے' جبکہ اصغر درمیان میں کھڑا کچھ عجیب و غریب حرکتیں کر رہا تھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے اپنے ساتھ بیٹھے رحیم سے کچھ پوچھا تھا' جس نے سردی کی وجہ سے ہاتھ جیکٹ کی جیب میں دے رکھے تھے۔

"پریکٹس کر رہا ہے۔ کل Annual Play کے لیے آڈیشنز ہو رہے ہیں بخاری آڈیٹوریم۔۔۔ میں۔۔۔"

مرتضیٰ نے سر ہلایا۔ وہ بہت دلچسپی سے اصغر کی جانب دیکھ رہا تھا۔

"تم آڈیشن دو گے نا؟" رحیم نے پوچھا۔ مرتضیٰ نے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ دراصل اس نے اس بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ کسی بھی Annual Play کے متعلق وہ جانتا ہی نہیں تھا' اس لیے دل و دماغ میں مچتی خوشگوار سی ہلچل کو چھپا کر وہ اصغر کی جانب دیکھ رہا تھا۔

"اوئے ہالے۔۔۔ آڈیشن دے گا؟" رضوان جو اس کے بالمقابل دائرے کی دوسری سمت میں بیٹھا تھا' اس کی جانب دیکھ کر استفسار کیا۔

"مرتضیٰ! تم آڈیشن ضرور دینا۔" اس نے ابھی جواب بھی نہیں دیا تھا کہ عاطف بول پڑا۔ سب ہی واقف تھے کہ وہ بے حد اچھا نقال ہے۔

"اس کو آڈیشن کی کیا ضرورت۔۔۔ یہ اس کے بغیر بھی سلیکٹ ہی سمجھو۔" یہ نجانے کون بولا تھا پھر وہاں بیٹھے سب ہی لڑکے اسے مشورے دینے لگے۔ وہ کسر نفسی سے کام لیتے ہوئے سر جھکا کر "نہیں' نہیں" کہتے ہوئے انہیں ٹالتا رہا مگر دل میں کتنے ہی بڑے بڑے غبارے اوپر سے اوپر اٹھ رہے تھے۔

"میں Annual play کے لیے آڈیشن دے رہا ہوں۔" اس نے رات کو پرجوش انداز میں سعدی کو بتایا۔

"ہوں۔۔۔ that s good ۔۔۔ تمہیں دینا چاہیے۔" سعدی کسی اسائنمنٹ میں الجھا تھا مگر پھر بھی وہ اسے وش کرتے ہوئے بولا۔

☆ ☆ ☆

دھوکا دہی کوئی ایسی انوکھی بات بھی نہیں تھی کہ وہ یہ کام کرتے وقت جھجک محسوس کرتا مگر مسئلہ یہ تھا کہ یہاں اس کا مقابلہ موت جیسے بڑے عفریت سے پڑا تھا' وہ اس لیے تذبذب میں گھر گیا تھا کہ اسے سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے احساسات کو کس طرح کیموفلاج کرے' وہ کس طرح لوگوں کا سامنا کرے۔ اس کے دل میں جھنجلاہٹ کے سوا کوئی جذبہ یا احساس ابھر ہی نہیں رہا تھا۔

وہ مرنے والے کے لیے محبت محسوس کر رہا تھا' نہ نفرت۔ سوائے باہر جا کر لوگوں کے سامنے کس طرح بیٹھنا ہے' کیا کہنا ہے' کیا نہیں کہنا ہے۔ فی الحال اسے یہ مسائل لاحق تھے اور اگر لمحہ بھر کے لیے بھی وہ ان مسائل کی جکڑن سے سکون پاتا تھا تو اس کا دل عجیب سی لاچار کیفیت میں گھر جاتا تھا۔ افسوس اور ملال صرف لمحہ بھر کے لیے اس کے دل میں ابھر رہا تھا اور پھر اپنا اثر چھوڑے بغیر ڈوبتا جا رہا تھا۔ اسے بالکل خبر نہیں تھی کہ اگلا لمحہ عمل کیا ہوگا۔ اسے تو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ انسان کو اس کی آخری منزل تک پہنچانے کے لیے دعائے مغفرت کے علاوہ اور کن چیزوں کی ضرورت پڑے گی۔

وہ انسان جو ہمہ وقت "سوچ" کو کوستا ہے کہ یہ تکلیف دہ کیفیت اسے کیوں ودیعت کی گئی یا وہ انسان جو اس امر کو اپنی بدنصیبی قرار دیتا ہے کہ اسے سوچنے والا دل کیوں دیا گیا۔ اگر وہ ایک لمحے کے لیے بھی اس خالی الذہن کیفیت کی تکلیف کو محسوس کرے تو ساری زندگی شکر کرتا نہ تھکے۔ کم از کم اپنے باپ کے کمرے میں بیٹھے اس نوجوان کی تو یہی حالت تھی۔

"اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟" یہ وہ سوال تھا جو اس کے ذہن میں کبوتر کی طرح چک پھیریاں لے رہا تھا۔ اس سوال میں فی الحال رنج تھا۔ ایسا رنج جو یکدم ایک نئی اور تکلیف دہ صورت حال کو محسوس کرنے کی ابتدائی کیفیت میں ہوتا

ہے۔ وہی بہنچ اس کو لاحق تھا۔ اس کی توانائیاں مضمحل ضرور ہوئی تھیں مگر ختم نہیں ہوئی تھیں' اس لیے وہ یہی سوچ رہا تھا۔

"اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔"

اس کے ذہن کو ابھی کوئی راہ فرار نہیں ملی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی پھر کوئی اندر داخل ہوا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور بے وجہ چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

"گھر میں برف بالکل نہیں ہے۔ گرمی زیادہ ہو گئی ہے.... برف چاہیے۔" اکبر نے بھیگی آنکھوں سے مدعا بیان کیا۔

"برف کا کیا کریں گے؟" اس نے حیرانی سے استفسار کیا۔

"میت کو ٹھنڈا رکھنا ضروری ہے اور پھر گھر میں اتنے لوگ بھرے ہیں' سب کو منٹ منٹ بعد پیاس محسوس ہونے لگتی ہے۔ بہت ساری برف کی ضرورت ہے۔"

وہ سابقہ انداز میں بولا۔ اس کے لہجے میں بہت سے آنسوؤں کی نمی گھلی تھی لیکن یہ نمی باسی ہو چکی تھی۔ وہ شاید بہت پہلے بہت سارو چکا تھا۔ اکبر ان لوگوں میں سے تھا' جو اس کے باپ کے آخری سفر کی بیماری تک ان کے ہمراہ تھا۔ اس کے باپ نے اکبر کے ہاتھوں میں زندگی کو آخری سلامی پیش کی تھی۔

"میت۔" اس کے منہ سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔ "ایک ہچکی انسان کو انسان نہیں رہنے دیتی' میت بنا دیتی ہے۔"

"میت کو ہال میں لے آئے ہیں.... ہال میں اے ٹرنل کولنگ سسٹم ہے۔ وہاں.... بہت...."

وہ کچھ کہتے کہتے رکا۔

"وہاں میت ٹھیک رہے گی.... جنازہ تو عشاء کے بعد ہے نا۔"

اب وہ اکبر کی جانب سے رخ پھیر کر اپنی قمیص پہن رہا تھا۔

"تائی کہہ رہی ہیں' ہال میں میت کو نہلانے کے بعد رکھیں گے' وہاں اتنی جگہ نہیں کہ سب لوگ سما سکیں۔ اگر ایسا کریں گے تو اے سی کی کولنگ بھی بے کار ہو جائے گی اور حبس بڑھنے سے خوامخواہ لوگوں کا دم گھٹے گا۔"

اکبر اسے پیغام پہنچانے آیا تھا' پہنچا کر چلا گیا۔

"میت.... مگر.... موت.... شی.... ہمت.... مرے....

میرے خدا۔" وہ ایک بار پھر گرنے کے سے انداز میں بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر تکیہ سر پر رکھے اور کم از کم بارہ چوبیس گھنٹے کے لیے سو جائے۔ اسے محسوس ہو رہا تھا اسے نیند کی اشد ضرورت ہے مگر وہ سو کیسے سکتا تھا۔

"برف چاہیے۔" اس کے کانوں میں اکبر کی آواز گونجی۔ اس نے پاؤں میں سلیپر ڈالے اور باہر کی جانب چلا۔ دروازے تک پہنچ کر اسے کچھ یاد آیا۔ ساڑھے انیس سو کے یہ سلیپر جب پہلی مرتبہ اس کے باپ نے دیکھے تھے' اس کے چہرے کے تاثرات عجیب سے ہو گئے تھے۔ اسے یاد تھا' وہ تاثرات کیسے تھے۔ اس نے ان تاثرات کو اپنے چہرے پر طاری ہوتا محسوس کیا اور پھر اس کے بائیں پہلو میں درد کی ایک لہر اٹھی۔

"کیا انہوں نے یہی درد محسوس کیا ہو گا؟" اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر سوچا۔ درد کی کوئی تشریح یا وضاحت کہاں ہوتی ہے کہ کوئی اس کے متعلق کسی کو توضیح پیش کر سکے مگر اس کا دل چاہا کہ وہ کیفیت جو ان نے محسوس کی ہے' وہ اسے مجسم دیکھ پاتا۔ وہ اس درد کی ہیئت کا اپنے باپ کے درد سے موازنہ کرتا اور پھر دیکھتا کہ ساڑھے انیس سو کا وہ چپل جو اس نے پاؤں میں پہن رکھا تھا' وہ ان دونوں میں سے کس کے لیے زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوا تھا۔ اسے لگا وہ سلیپرز بھاری قوت سے اس کے سر پر برس رہے ہیں۔ ایک جھٹکے سے اس نے انہیں اپنے پاؤں سے علیحدہ کر دیا اور واش روم کے باہر پڑے ہوائی چپل پاؤں میں ڈال لیے۔ یہ اس کا ایک اضطراری عمل تھا۔ یہ سب اس نے کیسے اور کیوں کیا' اسے پتا ہی نہیں چلا تھا۔

ان ہی سلیپرز کو پہنے وہ باہر آ گیا تھا۔ اب کی بار وہ لاؤنج سے گزرا تو وہاں بیٹھی خواتین نے اسے بہت غور سے دیکھا اور پھر دیکھتی رہی تھیں۔ اسے ان کی نگاہوں سے از حد الجھن ہوئی۔ وہ اسے ایسے دیکھ رہی تھیں جیسے وہ کوئی عجوبہ ہو۔ ان کی نگاہوں نے اس کے تاسف اور ملال کو بڑھا دیا تھا۔ وہ اس کیفیت سے دامن چھڑاتا ایک بار پھر کار پورچ کے سامنے گھاس کے قطعے پر آ کھڑا ہوا تھا۔ دھوپ کی شدت میں تیزی آ چکی تھی اور واقعی سارا گھر سسکیوں آہوں اور لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔

لان کا کچھ حصہ جہاں اس کے باپ کی میت رکھی تھی' وہاں کسی بوڑھی عورت کے کراہنے کی آوازیں

آ رہی تھیں۔ گاؤں سے شاید گاڑی بھر کر غریب دیہاتی رشتہ دار آ چکے تھے۔

"برف لانے کے لیے پیسے دے دیں۔"

ان کا ملازم اس کو دیکھتے ہی بھاگتا آیا تھا' اسے نہیں پتا تھا کہ برف لانے کے لیے کتنے روپے درکار ہوتے ہیں۔ اس نے قمیص کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس کا والٹ بیڈ روم میں رہ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ والٹ منگوانے کے لیے ملازم کو دوڑاتا۔ انکل صدیق نے اپنے والٹ سے روپے نکال کر اسے دے دیے۔ شرمندگی کی ایک اور لہر اس کے گرد ہلکورے لینے لگی۔ وہ اس کے قریب چلے آئے اور انہوں نے ایک بار پھر اسے خود سے لپٹا لیا۔ ان کے وجود سے امپورٹڈ پرفیوم کی مہک اٹھ رہی تھی۔ ان کی شخصیت یہاں موجود سب لوگوں سے شاندار تھی۔ اسے ان ہی سے سب سے زیادہ خوف محسوس ہوا۔

"زندگی ریورس ہو سکتی تو میں اسے دس سال پیچھے لے جاتا۔ دس سال پہلے حالات اتنے تکلیف دہ نہیں تھے.... حقیقت یہ ہے کہ میں انہیں ابھی بھی تکلیف دہ نہیں سمجھتا تھا۔ مجھے.... پتا ہی نہیں چلا.... کہ.... وہ تمہارا باپ.... اتنے مصائب سہہ رہا ہے.... بہت اچھا انسان تھا وہ۔"

انکل صدیق اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے دھیمے لہجے میں کہہ رہے تھے۔ وہ انہیں انکل صدیق ہی کہتا تھا۔ حالانکہ اس کے باپ کی خواہش تھی کہ وہ انہیں چچا کہے مگر وہ شروع سے ہی ان کی مرضی کے خلاف کام کرتا تھا۔

"میری اس سے آخری ملاقات.... پانچ سال پہلے ہوئی تھی.... میں اس پر بہت غصہ ہوا۔ مجھے پتا تھا وہ گاؤں چھوڑ چکا ہے.... مگر.... میں نے اسے.... بہت ڈانٹا.... وہ ہنستا رہا.... وہ شروع سے.... ایسا ہی تھا۔" انکل صدیق کا لہجہ بدل رہا تھا۔ ان کی آنکھیں گیلی گیلی سی لگنے لگی تھیں۔

"مجھے.... اس کے ہنسنے پر بہت غصہ آیا۔"

"مجھے بھی آ جایا کرتا تھا۔" ان کے منہ سے یہ سب سنتے ہوئے اس نے سوچا۔

"میں نے.... اس.... کی بہت.... بے عزتی کی.... وہ کچھ نہیں بولا.... میں نے اسے.... بے حد برا بھلا کہا.... جتنا کہہ سکتا تھا.... اتنا ہی کہا.... میں نے اس کی بات کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی.... میں...."

وہ خاموش ہو گئے تھے۔ اس نے انہیں آنکھوں کو صاف کرتے دیکھا۔ ان کی باتوں کے جواب میں اسے کیا کہنا چاہیے' اسے نہیں پتا تھا۔ وہ کافی دیر تک اسی طرح خاموش کھڑے رہے۔

"میں.... جانتا ہوں.... وہ مجھ سے بہت.... محبت کرتا تھا.... میں نے.... اس.... کی محبت کی.... قدر ہی نہیں کی.... گاؤں سے شہر آ جانے کے بعد.... وہ جب بھی مجھے ملنے.... میں نے اسے اور اس کی محبت کو ایکسپلائٹ کیا.... وہ پوچھتا نہیں کرتا تھا' کچھ بھی نہیں.... اسے تم سے.... بہت محبت تھی.... میری ہر پھٹکار کے جواب میں مسکرا کر کہتا.... انسان کب تک اپنے لیے جیے.... اسے اولاد کے لیے جینا پڑتا ہے.... کہتا میں واپس نہیں جاؤں گا.... میرا بیٹا گاؤں میں نہیں رہ سکتا.... اور میں اسے مزید برا بھلا کہتا.... وہ واقعی بہت اچھا.... انسان تھا.... اس کا چہرہ دیکھو.... ایسے پرسکون ہو کر لیٹا ہے' جیسے اس دنیا سے چلے جانا اس کی سب سے بڑی.... خوش قسمتی ہو۔"

وہ ایک بار پھر آنکھوں کے کنارے صاف کر رہے تھے۔ انہوں نے اسے ایک بار پھر اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ انہوں نے اس کی پیشانی چومی۔ ان کی آنکھوں میں ملال کے رنگ تھے۔ ان کے وجود سے اٹھتی امپورٹڈ پرفیوم کی مہک یکدم کافور کی مہک میں تبدیل ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

O that this too solid flesh would melt,
Thaw and resolve itself into a dew
Or that the Everlasting had not fixd
His canon gainst self slaughter!
O God! O God!

اس نے ابھی یہاں تک ہی زیرلب گنگنایا تھا کہ واسع نے اسے روک کر ہاتھ کے اشارے سے اسے سامنے سے ہٹ جانے کے لیے کہا۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ بغور واسع کی جانب دیکھا۔

"آپ ادھر بیٹھیں۔ ہاں جی نیکسٹ پلیز۔" اس نے اگلا کہا۔ مرتضیٰ نے لٹکا کر دھیمی چال چلتا اس سمت میں کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ وہاں پہلے سے کچھ اور لڑکے بھی

براجمان تھے۔ وہ سب آڈیشن دے کر فارغ ہو چکے تھے۔ مرتضیٰ نے سب کے چہروں کی جانب بغور دیکھا۔ کسی چہرے پر ویسی مایوسی نہیں تھی جیسی وہ محسوس کر رہا تھا۔ مایوسی کے ساتھ ساتھ خفت بھی تھی جو اس کے دل و دماغ کا گھیراؤ کر رہی تھی۔ وہ جانتا تھا اس نے ڈائیلاگ کی ادائیگی میں گڑبڑ کی ہے۔ یہ کسی بھی قسم کے آڈیشن دینے کا پہلا تجربہ تھا' سو وہ کافی گھبرایا ہوا تھا لیکن اس نے اس گھبراہٹ کو چھپانے کے لیے کافی کوشش کی تھی۔ اس کا ذاتی خیال تھا کہ اس نے ابتدا اچھے طریقے سے کی تھی مگر درمیان میں اس کی نظر سامنے کھڑے چند لڑکوں پر پڑ گئی تھی جن کے چہروں پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ اس مسکراہٹ نے اس کے اعتماد کو متزلزل کر دیا تھا پھر واسع کے چہرے پر پھیلی بیزاری بھی اسے جتا رہی تھی کہ وہ یہ کام نہیں کر سکتا۔ واسع کالج کا بیسٹ ایکٹر تھا۔ وہ گزشتہ تین سال سے بہترین کار کردگی کا مظاہرہ کر تا رہا تھا اور اب جس پروفیشنل انداز میں وہ آڈیشن لے رہا تھا' یہ بھی ثابت کرتا تھا کہ وہ اپنے کام میں واقعی منجھا ہوا ہے۔

"ہمیں یہاں کیوں بٹھایا ہے؟" اس کے ساتھ بیٹھے اکبر نے کرسی پر بیٹھے ٹانگیں ہلاتے ہوئے سوال کیا۔

"ہمیں بے عزتی سے بچانا چاہتے ہیں' اس لیے۔" طلحہ نے جواب دیا۔

"ہمیں سلیکٹ نہ کر کے انہوں نے ہماری تو بے عزتی کی ہے' اس کا ازالہ اس طرح کرسی پر بٹھا دینے سے تو نہیں ہو گا۔ مرتضیٰ! تجھ سے بھی کچھ نہیں کہا اس نے؟" اکبر پھر بولا۔ ان سب کو حیرانی تھی کہ مرتضیٰ بھی ریجیکٹ ہو چکا ہے۔

"ہاں' انہیں کم از کم ایک آدھ رول تو ہمیں پیش کرنی ہی چاہیے۔" سفیر کی چہچہاتی ہوئی آواز بھی نکلی تھی۔ وہ سب ہنسنے لگے۔

"یہاں بٹھانے کا مطلب یہ کہ ہمیں ریجیکٹ کر دیا گیا ہے۔" مرتضیٰ نے اکبر کی جانب دیکھا۔

"شاباش اے بادشاہو! یہ دا ہور کی مطلب ہو سکدا اے۔" وہ کان کھجا کر بولا۔ "ویسے تجھے ریجیکٹ نہیں کرنا چاہیے تھا اس لمبو کو۔" اشارہ واسع کی جانب تھا۔

"تو پھر ہم یہاں کیوں بیٹھے ہیں۔ ایسی کی تیسی ہیملٹ اور اس کے ہوتے سوتے واسع کی۔۔۔ ہم جا رہے ہیں۔"

سب سے پہلے طلحہ اٹھا تھا پھر اکبر بھی اٹھ گیا۔ سفیر اور وہ کچھ دیر بیٹھے رہے پھر سفیر بھی چلا گیا۔ اب اس کے جاننے والوں میں سے سوائے اس کے کوئی موجود نہیں تھا۔ دیگر، دوسرے سیکشنز کے سینئرز جو بیٹھے تھے جو اپنی اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔

وہ ان لوگوں کی جانب دیکھنے لگا جو یکے بعد دیگرے سامنے آ رہے تھے اور پرفارم کر رہے تھے۔ بہت سے لڑکے بہت اچھا بھی پرفارم کر رہے تھے۔ مرتضیٰ کافی دیر تک ان ہی کی جانب متوجہ رہا۔ اسے یہ سب دیکھنا اچھا لگ رہا تھا۔ اسی دوران ایک لمبا گورا چٹا لڑکا آ کر پرفارم کرنے لگا تھا۔ اس کے ایک بار پرفارم کرنے پر ہی سب اس کی جانب متوجہ ہو گئے تھے۔

"یہ ڈائیلاگز ریپیٹ کرو۔" اس نے واسع کو کہتے سنا۔ اس لڑکے نے واسع کے لہجے سے حوصلہ پکڑ کر دوسری بار پہلے سے بھی زیادہ بہترین انداز میں پرفارم کیا تھا۔ واسع کے چہرے پر پسندیدگی بڑھی تھی۔ وہ لڑکا وہی ڈائیلاگز بول رہا تھا جو مرتضیٰ کو دیے گئے تھے۔ مرتضیٰ کو دکھ سا ہوا۔ اسے لگا یہ اس کے ساتھ حق تلفی ہو رہی ہے۔ کیونکہ وہ اسی انداز میں ڈائیلاگز ادا کر رہا تھا جس میں کہ وہ لڑکا ادا کر رہا تھا۔

"اب یہ والے ڈائیلاگز ادا کرو۔" واسع نے اس لڑکے کو ایک کاغذ تھمایا تھا۔

وہ لڑکا بغور کاغذ کی جانب دیکھنے لگا۔ اس نے دو بار اونچی آواز میں ان ڈائیلاگز کو پڑھا اور پھر وہی کاغذ واسع کو واپس پکڑا دیا۔ وہ درمیان میں آ کھڑا ہوا۔ اس نے چند لمحے ایسے ہی کھڑے گزار دیے جیسے کچھ سوچ رہا ہو پھر وہ یکدم دو قدم دھیرے سے آگے بڑھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بالکل بدل چکے تھے۔

me by the wrist and held me hard
He took
goes he to the length of all his arm:
then
his other hand thus over his brow,
And with

اس نے ابھی یہاں تک ہی کہا تھا کہ واسع نے تالیاں بجا کر اسے داد دی۔ پاس کھڑے لڑکے بھی اسے ستائشی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ مرتضیٰ بھی اس کے انداز سے

والا متاثر ہوا مگر ساتھ ہی دل میں جلن بھی ہوئی۔ وہ لڑکا شاید کسی لڑکی کے ڈائیلاگ بول رہا تھا کیونکہ اس نے آواز کو بے حد باریک اور مترنم بنا کر ڈائیلاگز ادا کیے تھے۔

"تم ہی ہماری Ophelia ہو گے۔" واسع نے اس لڑکے سے ہاتھ ملا کر کہا۔ مرتضیٰ کا دل جل کر خاک ہو گیا تھا۔ وہ اب یہاں مزید نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اٹھتے اٹھتے اس کے دل میں نجانے کیا سمائی کہ واسع سے اپنے متعلق پوچھنے کھڑا ہو گیا۔

"آئی ایم سوری یار! میں بندہ بہت اسٹریٹ فارورڈ ہوں۔ تمہارا خیال اگر ایکٹنگ کا ہے تو اسے دل سے نکال دو۔۔۔ یہ تمہارے جیسے پینڈو کا کام نہیں ہے۔ میرا تمہیں خاص مشورہ ہے' اپنا ٹائم ضائع کرو نہ توانائیاں۔۔۔۔ یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہے' میری صاف گوئی کا برا مت ماننا۔ اگر تم مجھ سے خود نہیں پوچھتے تو میں تمہیں کبھی نہ بتاتا۔۔۔ تم کبڈی شبڈی کھیلنے کی طرف دھیان دو قادر!"

واسع نے بہت محبت سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر دھلائی کا آغاز کیا۔

قادر کے نام پر مرتضیٰ نے چونک کر اس کی جانب دیکھا پھر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر اتنی دیر میں واسع آگے بڑھ چکا تھا۔ اسے مرتضیٰ کا نام یاد نہیں تھا' اداکاری خاک یاد رہتی۔ مرتضیٰ کو اس کے الفاظ فقط برے لگے تھے مگر انداز اور نام بھول جانے کی ادا تو بے حد بری لگی۔ سو وہ بوجھل قدم لیے بخاری آڈیٹوریم سے باہر آ گیا۔

☼ ☼ ☼

"تم نے ہیملٹ پڑھا ہے؟" سعدی نے اس کے لٹکے منہ کو دیکھ کر نرم لہجے میں پوچھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے کارڈز سے نظریں ہٹا کر اس کی جانب دیکھا پھر فلور کشن پر پڑا کوئین کا کارڈ اٹھا لیا۔

"نہیں۔" کارڈز کو سیٹ کرتے ہوئے وہ بے دلی سے بولا۔ اس کا کھیلنے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا مگر سعدی کا موڈ تھا' سو اس کے اصرار پر اب وہ دوسری باری کھیل رہے تھے۔ پہلی باری مرتضیٰ ہی جیتا تھا مگر روزی طرح اس نے جیت پر جھگڑا نہیں ڈالا تھا۔ اسے یقین تھا کہ سعدی جان بوجھ کر ہارا ہے۔

"ہیملٹ کون تھا' یہ پتا ہے؟" سعدی نے اس کی بے دلی کو اہمیت دیے بغیر دوسرا سوال پوچھا۔

"شیکسپیئر کے ڈرامے کا نام ہے۔" اس نے دس کا کارڈ رکھتے ہوئے سابقہ انداز میں جواب دیا۔

"ڈرامے کے بیچ اسٹیلے میں ہیملٹ کون تھا۔ یہ پتا ہے؟" سعدی نے وہی دس کا کارڈ اٹھا کر یکہ پھینکا تھا۔

"ہاں پتا ہے' بادشاہ تھا۔" وہ غرا کر بولا۔ سعدی اس کے تند لہجے پر چند لمحے اسی کی جانب دیکھتا رہا۔ مرتضیٰ کو احساس تھا کہ وہ اپنے لہجے سے سعدی کو ہرٹ کر چکا ہے۔

"مجھے نہیں کھیلنا۔" اس نے ہاتھ میں پکڑے سارے کارڈز پھینک دیے۔

"ہارنے کے ڈر سے گیم چھوڑ دینے والے لوگ ہمیشہ ناکام رہتے ہیں۔" سعدی نے ابھی بھی تحمل کا مظاہرہ کیا تھا۔

"میں نے ہارنے کے ڈر سے گیم نہیں چھوڑا۔۔۔۔ مجھے اس طرح کے کسی گیم میں حصہ لینا بھی اچھا نہیں لگتا جس میں میرے ساتھ جانبداری برتی جائے۔ تم جان بوجھ کر گیم ہار رہے ہو۔ پہلے تم نے کنگ پھینک دیا پھر یکہ بھی پھینک دیا۔ مجھے اس مہربانی کی ضرورت نہیں۔ اللہ اور اس کے رسول نے صلہ رحمی کی تلقین کی ہے مگر یہ نہیں کہا کہ گیمز میں صلہ رحمی کی خاطر جان بوجھ کر ہار جاؤ۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔

"تمہیں کس نے کہا میں گیم ہار رہا ہوں۔ یہ یکہ میں نے اس لیے پھینکا تاکہ تم اسے اٹھا کر کنگ کا کارڈ پھینک دو اور کنگ کا کارڈ میں نے اس لیے پھینکا تھا تاکہ تمہیں ڈاج دے سکوں۔ تم یکہ اٹھا کر کنگ پھینکتے تو میں اسے اٹھا لیتا اور اپنے پتے شو کروا دیتا۔"

اس نے مرتضیٰ کے پھینکے ہوئے کارڈز میں سے کنگ اٹھا کر اپنے چاروں پتے شو کروا دیے۔ وہ چاروں کنگ تھے۔ مرتضیٰ نے پہلے چاروں پتوں کی جانب دیکھا پھر اس کی شکل کی جانب اور اس کے بعد دل میں امڈنے والی شرمندگی کو چہرے پہ ظاہر نہ ہونے دینے کے لیے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"تمہاری زبان بہت چلنے لگی ہے لیکن پھر بھی تمہیں موقع محل کے مطابق ری ایکٹ نہیں کرنا آیا۔ جس بات پر غصہ آ رہا ہے' اسی بات پر غصہ نکالو۔ کسی چیز کا غصہ کسی دوسری چیز پر نکالو گے تو صرف خسارہ ہو گا۔"

اب کی بار سعدی بھی اونچی آواز میں بولا۔ مرتضیٰ نے گہری سانس بھری۔
"آئی ایم سوری.... تم ٹھیک کہہ رہے ہو.... مگر...." وہ اتنا ہی کہہ سکا تھا کہ سعدی نے اسے ٹوک دیا۔
"ہیملٹ کی بات کرتے ہیں۔" وہ اسے گھیر گھار کر اس موضوع پر لا رہا تھا۔
"دفع کرو یار۔ مجھے اس ٹاپک پر کوئی بات نہیں کرنی۔" وہ افسردگی سے بولا۔
"ایسے کیسے دفع کردیں یار۔ ایک پتے کی بات بتاؤں تمہیں۔ جس چیز کو آپ خود ریجیکٹ کردیتے ہیں وہ اگلے دن آپ کو بھول جاتی ہے لیکن جو چیز آپ کو ریجیکٹ کردیتی ہے اسے آپ ساری زندگی نہیں بھلا پاتے۔ آڈیشن میں ناکام ہوجانا اتنی بڑی بات نہیں کہ اس کے لیے خود کو مینٹلی ٹارچر کیا جائے اور اگر تم اس ٹاپک پر بات نہیں کرو گے تو تمہیں کیسے پتا چلے گا کہ تم آڈیشن میں کیوں ناکام ہوئے۔"
سعدی نے کہتے ہوئے فلور کشنز پر بکھرے کارڈز سمیٹ کر بھینچنے شروع کردیے تھے۔ مرتضیٰ نے تپاکی نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔
"تو تمہیں پتا چل گیا۔" اس نے سادہ سے انداز میں کہا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اپنے منہ سے کچھ نہیں کہے گا تو شاید اردگرد والوں کو پتا بھی نہیں چلے گا کہ کیا ہوا ہے۔ حالانکہ آڈیشن سے پہلے وہ جتنا پرجوش تھا اب اس کے لٹکے چہرے نے ہر ایک کو اس کی ناکامی کا اشارہ دے دیا تھا۔
"ظاہر ہے مجھے بھی پتا ہی چلنا تھا۔ تم نے شکل ہی میت جنازے والی بنا رکھی ہے۔ مجھے حیرت اس بات پر ہورہی ہے کہ ایک آڈیشن میں فیل ہوجانا اتنا اہم ہوتا ہے کہ انسان ذکر ہی نہ کرے۔ دوستوں سے منہ چھپا کر چھپ جائے اور بس...."
وہ لمحہ بھر کے لیے رکا، پھر شرارتی انداز میں بولا۔
"اور پھر دفع کردیا۔ تمہیں پتا ہے، طلحہ اور زبیر وہاں کامن روم میں کیا کررہے ہیں۔ زبیر واسع بنا ہوا ہے جبکہ طلحہ آڈیشن دینے والے مختلف لوگوں کی نقل کرنے کی کوشش کررہا ہے جبکہ زبیر بالکل اسی طرح ری ایکٹ کررہا ہے جیسے واسع کررہا تھا۔ تم جاکر دیکھو تو سہی وہ اپنی ناکامی کو کس طرح سیلیبریٹ کررہے ہیں۔ جبکہ تم یہاں ماتم کررہے ہو۔"
کارڈز کو سعدی نے سائڈ میں رکھ دیا تھا۔ مرتضیٰ نے کوئی رسپانس نہیں دیا۔ وہ اسی انداز میں بیٹھا رہا۔
"اچھا چلو میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اس پلے میں ہوا کیا ہے۔ ہیملٹ کا نام تم نے پہلی بار سنا ہے، اس لیے تم اس کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ یہاں تک کہ تمہیں یہ بھی نہیں پتا کہ ہیملٹ بادشاہ نہیں بلکہ شہزادہ تھا۔ میں جو کچھ تمہیں بتاؤں گا اس سے تم یہ مت سمجھنا کہ میں تمہیں جاہل یا دیہاتی کا طعنہ دے رہا ہوں۔ اب پلیز اس بات کی وضاحت مت دینا۔ میں جانتا ہوں کہ میں جب بھی تمہیں کوئی بات بتانے کی کوشش کرتا ہوں جس کے متعلق تم پہلے سے نہیں جانتے تو تم سمجھتے ہو میں تمہیں چینج کررہا ہوں۔"
مرتضیٰ نے بہت مشکل سے خود کو چونکنے سے بچایا۔ وہ یہ بات محسوس ضرور کرتا تھا مگر اپنے منہ سے اس نے سعدی کو کبھی ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ سعدی اسے کچھ بتانے لگتا تو اسے برا محسوس ہوتا مگر جب سعدی کی بات مکمل ہوتی تو اسے احساس ہوتا کہ یہ اس کے فائدے کی بات تھی۔ سعدی کی وجہ سے ہی وہ دوسرے کالج میٹس اور ہاسٹل میٹس کے ساتھ زیادہ پراعتماد طریقے سے بات کرنے کے قابل ہوا تھا۔
"شہزادہ ہیملٹ اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لینا چاہتا ہے کیونکہ اسے ابتدا میں شک اور پھر یقین ہوجاتا ہے کہ اس کے باپ کو اس کی ماں نے اپنے عاشق کے ساتھ مل کر قتل کیا ہے۔ اوفیلیا اس کی منگیتر اور محبوبہ ہے۔ سرنال کہانی کی تھیم "انتقام" ہی ہے۔ ہیملٹ اس میں ڈبل کیریکٹر ادا کرتا ہے۔ کچھ سین میں یہ ذہین، فطین جبکہ کچھ میں پاگل کا کردار نبھاتا ہے۔ سارے پلے میں ہی کچھ چلتا رہتا ہے۔ تم خود سوچو، ایک ایسا شخص جو اپنی ماں کو ہی اپنے باپ کے قتل کی وجہ گردانتا ہو کس قسم کا ری ایکشن شو کرے گا۔ زیادہ تر پلے ہیملٹ کے گرد ہی گھومتا ہے۔ اب ہیملٹ کے لیے واسع جس لڑکے کو چنے گا، اسے یقیناً ایکسٹرا آرڈنری ہونا چاہیے، ورنہ وہ سارے پلے کو تباہ کرنے کا موجب ہوسکتا ہے۔ واسع کو میں فرسٹ ایئر سے جانتا ہوں۔ ان کی ججمنٹ غلط نہیں ہوسکتی، اس نے بہتر...."

سعدی بہت نرم لہجے میں اسے بتا رہا تھا۔ آخری بات پر مرتضیٰ نے شکوہ کناں نگاہوں سے اسے دیکھا، پھر اس کی بات کاٹ کر بولا۔
"میں یہ نہیں کہہ رہا کہ اس کی ججمنٹ غلط ہے۔ میں نے مجھے پورا ٹائم بھی نہیں دیا کہ میں ٹھیک طریقے سے اپنے ڈائیلاگز بول پاتا اور مجھے سامنے سے ہٹ جانے کے لیے کہہ دیا۔ میں لیڈنگ رول نہ سہی کوئی اور چھوٹا موٹا رول تو کرسکتا تھا نا۔"
سعدی نے ہونٹ بھینچ کر اس کی جانب دیکھا۔
"تمہارے گھر میں ٹی وی ہے؟" سعدی نے پوچھا۔
"نہیں۔" اس نے کہا۔
"ریڈیو تھا لیکن وہ اماں جی کی ایک مرغی کی وجہ سے آج کل مرحومین کی فہرست میں شامل ہوگیا ہے۔"
"تم نے کبھی کوئی انگلش مووی بھی نہیں دیکھی ہوگی۔" مرتضیٰ کے جواب کا انتظار کیے بغیر سعدی نے فلور کشن سائیڈ میں کیا اور پھر اس پر بیٹھ کر مرتضیٰ کے لیے ٹیک بناتے ہوئے بولا۔
"مجھے وہی ڈائیلاگ سناؤ جو تمہیں آڈیشن کے دوران بولنے کے لیے دیے گئے تھے۔"
"تم میرے ساتھ کیا کررہے ہو؟" مرتضیٰ چڑ گیا۔ سعدی نے اس کے انکار کو اہمیت دیے بغیر اس کی جانب غور سے دیکھا۔ مرتضیٰ بھی کچھ لمحے ہونٹ بھینچ کر اس کی جانب دیکھتا رہا، پھر جیسے زچ ہوکر اٹھا۔
اس نے کمرے کے درمیان کھڑے ہوکر اسی انداز میں ڈائیلاگ ادا کرنے شروع کیے۔ جیسے صبح واسع کے سامنے کیے تھے۔ ڈائیلاگز تو اسے صبح ہی ازبر ہوگئے تھے، اس لیے وہ بھولے تو نہیں تھے مگر صبح کی نسبت انداز مزید برا ہوگیا تھا کیونکہ وہ ذہنی طور پر بھی کچھ اپ سیٹ تھا۔
"اوکے۔ اب تم میری طرف دیکھو۔" اس کے خاموش ہوتے ہی سعدی اٹھا اور بالکل اس مقام پر آکھڑا ہوا، جہاں مرتضیٰ کچھ دیر اداکاری کرکے دکھا رہا تھا۔ اس نے وہی ڈائیلاگز بول کر دکھائے۔ اس کا لہجہ اور انداز واقعی مرتضیٰ کو کافی متاثر کن لگے۔
canon gainst self sluaghter"
"His" کہتے ہوئے تمہیں ہاتھ نیچے رکھنے چاہیے تھے بلکہ "O God" کہتے ہوئے دوبارہ اوپر اٹھا کر اشارہ کرنا چاہیے تھا۔ ایکٹنگ صرف ڈائیلاگز بولنے کا نام نہیں

ہے۔ آپ کو سر کے بالوں سے پاؤں کی چھوٹی انگلی ہر ہر عضو کو استعمال میں لا کر اپنا پوائنٹ آف ویو واضح کرنا پڑتا ہے۔ آپ اپنی باڈی لینگویج سے ہی ثابت کر دیتے ہیں کہ ڈائیلاگز کیا ہیں۔"

وہ پورے کمرے میں گھوم کر اپنی بات کی وضاحت کر رہا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ چارپائیاں بچھا کر کمرے میں گھومنے کی زیادہ گنجائش نہیں رہتی تھی۔

"تمہارا تلفظ بھی بہت پُور ہے۔ دیکھو مرتضیٰ! ہر زبان کی اپنی حاجات اور جذبات ہوتے ہیں۔ ایک بات جو اردو زبان میں ایک انداز سے کہی جاتی ہے اور جب انگلش میں وہ بات کرتے وقت وہی انداز اپنایا جاتا ہے تو اچھی بھلی بات اپنے معنی و مطالب کھو دیتی ہے۔ انگلش کے ایموشنز اردو میں اور اردو کے انگلش میں شو کرو تو مزہ نہیں آتا۔ انگریز ایموشنز کے معاملے میں ذرا ٹھنڈے ہوتے ہیں۔ دہاڑیں مار کر رو سکتے ہیں نہ قہقہے لگا کر ہنس سکتے ہیں۔ کسی بھی چھوٹی بات پر خوشی سے جھگڑے ڈالنا ہم ایشیائیز کو ہی سوٹ کرتا ہے۔ وہ انتہائی دکھ اور انتہائی خوشی کے درمیان میں رہ کر زندگی گزارتے ہیں۔ اس لیے اگر تم ہیملٹ کے ڈائیلاگز کو ایسے ادا کرو گے جیسے تمہارے سلانوالی میں تمہارے بال کاٹنے والا نائی بولتا ہے تو پھر یہی ہو گا میرے دوست جو آج تمہارے ساتھ ہوا ہے۔"

وہ سانس لینے کو رکا پھر چارپائی پر بیٹھ کر باری باری دونوں شانے سہلانے کے بعد بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"اس لیے میں تو یہی کہوں گا کہ تمہاری آج کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ تم نے آڈیشن دیا۔ وہ تو شیکسپیئر کا ہیملٹ تھا۔ اگر اردو کا کوئی ڈرامہ ہوتا تو میں تب بھی تمہیں کبھی سلیکٹ نہ کرتا۔ اگر میں واسع ہوتا تو۔"

اتنا کہہ کر سعدی نے ایک بار پھر رک کر اس کی جانب دیکھا۔

"دراصل تمہارا لہجہ فی الحال ان دونوں زبانوں کے لیے ناموزوں ہے۔ پہلے اپنی زبان کو اردو لہجے کا بگھار لگاؤ پھر انگلش کا تڑکا لو اور اس کے بعد جس مرضی پلے رائٹ کے پلے کے لیے آڈیشن دے دینا۔ کوئی تمہیں ریجیکٹ نہیں کرے گا کیونکہ بہرحال اداکاری کے جراثیم تم میں ہیں۔ مایوسی ان جراثیم کے لیے مہلک ثابت ہو گی۔" وہ اب چارپائی پر لیٹ گیا تھا۔

"نہیں کیا کروں۔ آئی ایم سوری سعدی! مگر میں ایسا ہی ہوں۔ مجھ سے ناکامی برداشت نہیں ہوتی۔ بچپن میں ابا جی کے ساتھ لڈو کھیلتے ہوئے میں ہار جاتا تھا تو سارا دن ابا جی سے بات نہیں کرتا تھا اور اس روز مجھ سے روٹی نہیں کھائی جاتی تھی۔ اب بڑا ہو گیا ہوں تو اس قسم کی چھوٹی موٹی شکست تو برداشت کر لیتا ہوں' آڈیشن کا ریجیکٹ ہو جانا چھوٹی شکست نہیں ہے۔"

انگلیاں مسل کر بات کرتے ہوئے وہ پھر اسی مقام آ کھڑا ہوا تھا۔ سعدی نے زچ ہو کر اسے دیکھا۔

"اوئے جاموتی ہی ہے خبیث انسان!" وہ اکتا کر بولا۔ مرتضیٰ بھی اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔

"ایک بات کہوں مرتضیٰ!" چند لمحوں بعد اسے سعدی کی آواز سنی تھی۔

"تم اس بات کو بہت سیریس لے رہے ہو۔ یہ تمہارا کیریئر یا زندگی بھر کا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ تمہارا مشغلہ ہے اس کو مشغلہ ہی سمجھو۔ تم ایک اچھے نقال ہو۔ تم لوگوں کی بہت اچھی کاپی کرتے ہو۔ یار دوستوں میں بیٹھ کر جب ایسا کرتے ہو تو وہ خوش ہوتے ہیں' تمہیں سراہتے ہیں۔ تمہاری ایک کوالٹی ہے جس کی وجہ سے تم کچھ دیر کے لیے خود انجوائے کر سکتے ہو اور دوسروں کو کروا سکتے ہو اور بس۔ اس سے زیادہ اہمیت مت دو اس چیز کو۔ اور مجھے بہت نیند آ رہی ہے۔ مرتضیٰ... مجھے امید ہے... تم... میری بات... گڈ... نائٹ... الارم لگا دینا... یار... ے۔"

واقعی اس کی آواز پہ غنودگی چھانے لگی تھی اور پھر اس کی آواز معدوم ہو گئی تھی۔ مرتضیٰ چارپائی پر چت لیٹا چھت پر لگے پنکھے کو گھور رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اسیسی نیشن (Assassination) کے اسپیلنگ بتادو۔" بہت دھیمی آواز میں پوچھا گیا تھا۔ کلاس روم میں گہرا سکوت تھا' سب ہی اپنے اپنے فولڈرز پر جھکے قلم چلانے میں مصروف تھے۔ پلٹ کر دیکھے بنا بھی وہ سمجھ گیا تھا کہ پوچھنے والا طلحہ ہے۔ سر رضوی کی کلاس میں اور وہ بھی ٹیسٹ کے دوران اس طرح سے پوچھنے کی ہمت طلحہ ہی کر سکتا تھا۔ وہ سر رضوی کے چند لاڈلے شاگردوں میں سے ایک تھا۔ جبکہ مرتضیٰ سے دونوں ہی برداشت نہیں ہوتے تھے۔ وہ انگلش سے خائف اور رضوی سے خوفزدہ رہتا تھا' اس لیے اس میں اتنی بھی ہمت

نہیں تھی کہ وہ پلٹ کر طلحہ کو اشاروں میں ہی اسپیلنگز بتاتا۔

"مرتضیٰ کے بچے۔ بتا دے نا۔" طلحہ نے پھر پکارا۔ مرتضیٰ جواب دینے کے بجائے سر جھکا کر تیز تیز قلم چلانے لگا۔

"دیکھ لے... پلیز بتا دے۔" اب کی بار طلحہ کی آواز زیادہ اونچی تھی۔ شاید وہ اس کی پشت کے قریب ہو کر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے کیا اسپیلنگز لکھے ہیں۔ مرتضیٰ کی جان ہی نکل گئی' اس نے سامنے کھڑے سر رضوی کی جانب دیکھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ اسی کی جانب دیکھ رہے ہیں۔ اس نے گھبرا کر نظریں چرائیں اور قلم کی رفتار تیز کر دی۔

"پرسوں میں نے تجھے پورا کونسیپٹ بتایا تھا... بتا دے... بھائی نہیں ہے میرا۔" وہ بچوں کی طرح جتا کر بولا۔

"نہیں۔" وہ چڑ کر بولا۔ ابھی ایک سیکنڈ بھی نہیں گزرا تھا کہ عقب سے کوئی نوکدار چیز اس کے کندھے میں چبھوئی گئی۔

"اوئی۔" وہ تڑپ کر اچھلا۔ ٹیسٹ مشکل تھا اور سب بے حد انہماک سے لکھنے یا نقل کر کے لکھنے میں مگن تھے۔ اس زنانہ پکار پر سب نے سر اٹھا کر دیکھا اور پھر سب ہی ہنس دیے۔ سب سے اونچا قہقہہ طلحہ کا تھا۔

"وات رَبش!" سر رضوی نے پلٹ کر گھورا۔ مرتضیٰ کندھا سہلاتا ہوا بیٹھ چکا تھا۔ سر رضوی اگرچہ کلاس سے بے حد بے تکلف تھے مگر جہاں ڈسپلن کا مظاہرہ کروانا ہوتا تھا' وہاں وہ کسی قسم کی لچک کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے۔ ان کی گھرکی پر سب ہی دوبارہ سے فولڈر کی جانب متوجہ ہو گئے۔ اگلے سات منٹوں میں ٹیسٹ مکمل ہوا اور جوابی کاپیاں سر رضوی کے لیدر بیگ میں منتقل ہو چکی تھیں۔

"الو کے پٹھے... تو واقعی غدار ہے... انڈیا کا ایجنٹ... ایک اسپیلنگ نہیں بتا سکا' یہ ہے تیری دوستی... میں تجھے طلاق دیتا ہوں... طلاق... طلاق۔ اور ہاں... یاد رکھنا میں تجھ سے بدلہ لوں گا۔"

طلحہ اپنی کرسی اس کی کرسی کے ساتھ جوڑ کر بھڑکا رہا تھا۔ مرتضیٰ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"یہ لڑکیوں کی طرح گیدڑ بھبکیاں بلکہ گیدڑنی بھبکیاں کسی اور کو دینا۔" اس نے ناک سے مکھی اڑائی۔

سر رضوی ہاتھ میں چاک لیے بورڈ پر کچھ بنانے لگے تھے۔ ساری کلاس ان کی جانب متوجہ ہو چکی تھی۔

"سر سے کو سکیچرز ہی ٹھیک ہیں۔ تصویر کیوں بنا رہے ہیں اپنی؟" پچھلی رو میں زبیر کی سرگوشی سنائی دی

"اور میرا پیغام ہے مسکراہٹ' جہاں تک پہنچے" کے مصداق اس کی سرگوشی جس جس کو سنائی دی' اس کے چہرے پر واقعی مسکراہٹ پھیل گئی۔ کیونکہ سر نے بورڈ پر ایک گدھے کی تصویر بنائی تھی۔ اس گدھے کے پیچھے انہوں نے ایک اور گدھا بنا دیا اور اسی لائن میں تیسرے نمبر پر nation لکھ دیا۔

"یہ کیا ہے؟" وہ کلاس کی جانب متوجہ ہو کر پوچھ رہے تھے۔

"گدھا۔" یک زبان ہو کر جواب پایا گیا۔

"غلط۔" انہوں نے روز روشن کی طرح عیاں حقیقت کو رد کر دیا تھا۔

"لینڈ!" سر کا مزاج کچھ زیادہ خوشگوار لگ رہا تھا' اسی لیے آخری نشستوں سے کسی چلبلے لڑکے نے کہا۔ سب ہنس دیے پھر جیسے یہ سلسلہ چل نکلا۔

"ہاتھی!" ایک اور آواز آئی۔

"نو۔" سر نے مسکرا کر نفی میں گردن ہلا کر کہا۔

"چیونٹی!" طلحہ بولا۔

"گوبھی کا پھول۔" عاطف کی آواز آئی۔

"ہنری کسنجر۔" مرتضیٰ نے بھی کھاتا کھولا اور سر رضوی کا قہقہہ سب سے بلند تھا۔

"یہ گدھا نہیں گدھی ہے۔" زبیر نے آنکھیں گھما کر کہا جیسے بہت پتے کی اور دلچسپ بات بتا رہا ہو۔ بھانت بھانت کی آوازوں میں سر خوب ہنس رہے تھے پھر انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو خاموش کروایا۔

"اوئے پاگلو... یہ گدھے ہیں۔" وہ بورڈ پر بنے دو گدھوں کی طرف اشارہ کر کے بولے۔

"واقعی...؟ اولاد کو باپ ہی پہچان سکتا ہے۔" مرتضیٰ نے سر جھکا کر کہا تھا تاکہ آواز ساتھ بیٹھے طلحہ کو ہی سنائی دے۔ وہ خوب ہنسا۔ ویسے بھی طلحہ ہنسنے کے لیے موقع تلاش کرتا تھا۔

"اس کا مطلب کیا ہے؟" انہوں نے یکدم ہی مرتضیٰ کی جانب دیکھا۔ اس کا ٹیسٹ کافی اچھا ہوا تھا' اس لیے وہ

خود کو کلی پر اعتماد سمجھ رہا تھا۔ سر کے اشارے پر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ سر آپ جیک آف آل ٹریڈز (ہر فن مولا) ہیں۔ آپ نا صرف انگلش بلکہ فائن آرٹس بھی پڑھا سکتے ہیں۔ آپ کی ڈرائنگ بہت اچھی ہے۔"

اس کے لہجے میں مخصوص شرارت تھی۔ سب ہنس دیے۔

"برخوردار! میں انگلش اور فائن آرٹس ہی نہیں 'نماز جنازہ' بھی بہت اچھی طرح پڑھا سکتا ہوں۔ آزمائش شرط ہے۔"

سر رضوی کے جواب نے مرتضیٰ کو مکمل طور سے ناک آؤٹ کر دیا۔ سب کو لگا تھا کہ مرتضیٰ کو سر نے لاجواب کر دیا مگر وہ سابقہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"آزمانے کی کیا ضرورت ہے سر جی... مجھے آپ پر پورا بھروسا ہے۔ ویسے اگر آپ کبھی نکاح پڑھانے میں انٹرسٹڈ ہوئے تو میں بخوشی قربانی کا بکرا بن جاؤں گا۔"

اس نے ثابت کیا کہ وہ چوکنے والوں میں سے نہیں ہے۔ سب تو ہنستے ہی تھے، سر کا قہقہہ کافی بلند تھا۔

"ویل سیڈ... ملانوالی والوں کو بڑی لمبی زبان لگ گئی ہے۔" وہ ستائشی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ سب ہوسٹلائٹ لڑکوں سے واقف تھے۔

"یہ چھپا رستم ہے سر! آپ اس کو معصوم نہ سمجھیں۔ یہ آپ کی بہت اچھی نقل کرتا ہے۔ اس نے ہمیں ہاسٹل میں آپ کی نقل کرکے دکھائی تھی۔ ہو بہو آپ کی کاپی لگ رہا تھا۔"

طلحہ کھڑا ہو کر آنکھیں گھماتے ہوئے بتا رہا تھا۔

"بیڑا غرق... یہ واقعی کمینہ ہے۔" مرتضیٰ نے دل ہی دل میں کہا۔ یہ سراسر مبالغہ آرائی تھی۔ اس نے کبھی سر رضوی کی کاپی کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"اچھا...؟ واقعی...؟ آجاؤ یار... سامنے آجاؤ... ہم تمہاری کارکردگی بھی دیکھ لیں۔"

وہ اسے باقاعدہ دعوت دیتے ہوئے بولے۔ ساری کلاس کے مزے ہو گئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا۔ انگلش کا نہیں ڈرامیٹکس کا پیریڈ چل رہا ہے۔

"یہ مذاق کر رہا ہے سر! جھوٹا ہے ایک نمبر کا۔" وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں ہلا تھا جبکہ طلحہ نے واقعی بدلہ لیا تھا۔ اب وہ مرتضیٰ کو آنکھیں گھما گھما کر دیکھ رہا تھا۔

"ارے آجاؤ بھئی... میں واقعی دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ کیسے کرو گے؟" ان کے انداز میں دلچسپی تھی۔

"سر جی! اس گدھے سے پہلے ہمیں بورڈ پر بنے گدھوں کے متعلق تو بتا دیں۔" رضوان جو واقعی پڑھائی کے سنجیدہ رہتا تھا، نے سر کو یاد دلایا۔

"ارے ہاں۔" سر کو یاد آیا، وہ بورڈ کی طرف متوجہ ہوئے۔ مرتضیٰ دل ہی دل میں شکر ادا کرتا اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ سر رضوی اب گدھوں کی تصویروں کے نیچے کیپشن دے رہے تھے۔ انہوں نے پہلے گدھے کی تصویر کے نیچے Ass لکھا، پھر دوسری تصویر کے نیچے بھی Ass لکھ دیا اور دونوں الفاظ کے درمیان (+) جمع کا نشان ڈال دیا۔

"Ass کا مطلب ہوتا ہے گدھا... اب ایک لطیفہ سن لو۔ ایک سردار جی اپنے بچوں کو Assassination کے اسپیلنگز ایسے یاد کروا رہے تھے۔ پہلے ایک گدھا پھر دوسرا گدھا اور ان کے پیچھے ساری قوم۔ یعنی پہلے Ass پھر Ass اور پھر پوری nation یعنی Assassination طلو! کچھ آیا عقل شریف میں۔" انہوں نے طلحہ کو بطورِ خاص دیکھ کر استفسار کیا۔ وہ جھینپا ضرور کہ سر کو اس کی بے ایمانی کی سمجھ پہلے ہی آگئی تھی مگر کھڑے ہو کر ڈھٹائی سے بولا۔

"جی سردار جی! میرا مطلب سر جی!"

ایک بار پھر سب ہنس دیے۔ سر نے ہاتھ میں پکڑا چاک اسے دے مارا اور ہاتھ جھاڑتے ہوئے مرتضیٰ کو کھڑے ہونے کا اشارہ کیا۔

"آجاؤ میدان میں۔"

وہ پہلے تو انکار میں گردن ہلاتا رہا پھر مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اٹھا اور روسٹرم کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ سر رضوی نے پہلی رو میں بیٹھے اصغر کو اٹھ کر پیچھے جانے کا اشارہ کیا اور خود اس کی جگہ پر بیٹھ گئے۔

اب چونکہ شامت آ ہی چکی تھی، سو مرتضیٰ نے ذہن میں جلدی جلدی سوچنا شروع کیا کہ سر کن مخصوص اشاروں کا بار بار استعمال کرتے ہیں یا بار بار کون سے الفاظ بولتے ہیں۔ وہ بائیں ہاتھ سے اپنی بائیں آنکھ کھجا کر کوئی بھی نکتہ سمجھاتے تھے اور "اوئے پاگلو" ان کا اپنے شاگردوں

لیے تخصیص بھرا پیار بھرا انداز تخاطب تھا۔ اس نے سر کے ساتھ بیٹھے راشد سے اس کی عینک لی۔ پھر سر کا چمڑی بیگ اٹھا کر کلاس روم کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے بولا۔

"ویری گڈ مارننگ اسٹوڈنٹس۔"

سر رضوی کلاس میں آتے ہوئے یہی کہتے تھے۔ اس نے ہو بہو انہی کے انداز کو کاپی کرنے کی کوشش کی۔ چمڑی بیگ کو روسٹرم کے اندر بنے خانے میں رکھ کر سینے پر ہاتھ باندھ کر سب لڑکوں کو گھورنے لگا، یونہی سر رضوی ایسے ہی کرتے تھے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ساری کلاس ان کی نظروں سے خائف ہو کر اپنی اپنی جگہ سنبھال لیتی اور خاموشی چھا جاتی تھی۔ مرتضیٰ نے یہی حرکت کی تو جیسے کلاس میں بھونچال آگیا۔ اس کا انداز اتنا فطری تھا کہ سب نے تالیاں بجانا شروع کر دی تھیں۔ طلحہ کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔ وہ جانتا تھا مرتضیٰ اچھا نقال ہے مگر اسے امید نہیں تھی کہ وہ اتنی اچھی نقالی بھی کر سکتا ہے۔ مرتضیٰ سر کے انداز میں کلاس روم میں راؤنڈ لے کر لیکچر دینے لگا۔ دس منٹ تک اس نے خود کو واقعی سر رضوی ثابت کرکے دکھا دیا تھا۔ ساری کلاس نے تالیاں بجا کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔

دس منٹ بعد جب وہ اپنی جگہ پر بیٹھا تو سر رضوی تالیاں بجاتے اور ہنستے ہوئے روسٹرم کے پیچھے جا کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے روسٹرم کے اندر پڑے چرمی بیگ کو کھول کر اس میں سے پچاس کا نوٹ نکالا اور پوائنٹر سے اس پر کچھ لکھنے لگے۔ اس کے بعد انہوں نے وہ نوٹ دست بستہ مرتضیٰ کی خدمت میں پیش کر دیا۔

"یہ تمہارا انعام ہے۔" اس کی ٹال مٹول کو نظر انداز کرتے ہوئے انہوں نے نوٹ اس کی بوشرٹ کی جیب میں رکھ دیا۔ نوٹ پر انہوں نے دعائیہ ریمارکس لکھے تھے۔

"یار! ایک بات بتاؤں؟ میں لیکچر کے دوران واقعی اتنی بار کہتا ہوں 'جتنی بار یہ مرتضیٰ کہہ رہا تھا۔'"

کلاس روم سے جانے سے پہلے یہ ان کی آخری جلوبری تھی۔ سب لڑکے ہنس دیے اور اس روز مرتضیٰ دونوں ہاتھوں سے داد و تحسین کے ٹوکرے بھرے گئے۔

✿ ✿ ✿

"یارو! ایک خوشخبری ہے۔" خاور نے قریب آتے ہوئے پرجوش انداز میں کہا تھا۔ آف پیریڈ کی وجہ سے وہ سب دوست گراؤنڈ میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

"تم پاپا بننے والے ہو... مبارک ہو..." ارباب نے کھلے دل سے مبارک دی۔ سب کے لبوں سے بے ساختہ قہقہہ ابلا تھا۔ سب ہی نوجوان تھے۔ بے فکری کا زمانہ تھا، سو بات بے بات قہقہے گونجتے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ واقعی کوئی خوشخبری سناتا، ایک لڑکا مرتضیٰ کو ڈھونڈتا ان تک آگیا۔

"سر رضوی، مرتضیٰ بھٹی کو اپنے آفس میں بلا رہے ہیں۔" وہ پیغام دے کر چلتا بنا مگر مرتضیٰ کا دل بہت زور سے دھڑکا۔ وہ خود کو سنبھالتا ان کے آفس کی جانب چل دیا۔ انہوں نے ایک اسائنمنٹ دے رکھا تھا مگر اس کی پریزنٹیشن اور سبمٹ کروانے کی تاریخ ابھی دور تھی۔ وہ قیاس کے گھوڑے دوڑاتا ان کے کیبن میں آگیا تھا۔

"آؤ ینگ مین... کلاس چھوڑ کر آئے ہو یا فری تھے۔" ان کا موڈ آج بھی خوشگوار لگ رہا تھا۔ فری کلاس کے متعلق بتا کر وہ ان کے اشارے پر سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کبھی ایکٹنگ کے متعلق سوچا ہے؟" دو ایک غیر ضروری باتوں کے بعد وہ اصل موضوع پر آگئے۔ مرتضیٰ کو واضح اور اس کا مفہوم اندازہ ہو گیا۔ اس کے لیے ایک آڈیشن ہی کافی تھا، سو اس نے سر رضوی کو نفی میں جواب دیا۔

"کیوں... گھر سے اجازت نہیں ہے؟" انہوں نے میز پر جھک کر اپنائیت سے پوچھا۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں سر... میں نے کبھی سوچا نہیں اس کے متعلق۔" اس کے لہجے میں عدم دلچسپی نمایاں تھی مگر وہ اپنے الفاظ سے بھی یہی ثابت کرنا چاہتا تھا لیکن رضوی صاحب ایسے کوئی اناڑی نہیں تھے کہ یہ سب محسوس نہ کر پاتے۔

"جھجکنے یا گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں تم کر سکتے ہو۔ تم میں انرجی ہے، پوٹینشل ہے اور سب سے بڑھ کر میں چاہتا ہوں کہ تم اداکاری کرو۔ کسی کا ٹیلنٹ ضائع ہو تو مجھے اچھا نہیں لگتا۔ ایک آدھ سین کرنے سے فرق نہیں پڑتا۔ تمہاری پڑھائی ڈسٹرب نہیں ہوگی بلکہ مجھے یقین ہے تمہاری صلاحیتیں مزید پالش ہوں گی

گی۔ ایک چانس مل رہا ہے تو اس کو avail کرو یار!"

وہ بے تکلفی سے اس کے کندھے کو تھپتھپا کر بولے۔ مرتضیٰ کو دل ہی دل میں بہت خوشی ہوئی۔ انکار کون کم بخت کرنا چاہتا تھا۔ مسئلہ صرف پہلے آڈیشن کی ناکامی کا تھا جو اس کے سارے شوق پر جھاڑو پھیرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سر رضوی کی باتوں نے واقعی اسے پمپ کر دیا تھا۔

"ہاشمی صاحب ڈرامیٹکس کے انچارج ہیں' تم ان سے جا کر مل لو۔ میرا ریفرنس دے دینا۔ وش یو بیسٹ آف لک۔"

انہوں نے مسکرا کر کہا۔ مرتضیٰ اٹھا اور دروازے کی سمت چل دیا۔

"اور ہاں سنو۔" دروازے تک پہنچا تھا کہ عقب سے ان کی آواز سنائی دی۔ وہ مڑا اور ان کی جانب دیکھنے لگا۔

"ایک آڈیشن میں فیل ہو جانے سے ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ تم کبھی فراغت میں میرے پاس بیٹھنا' میں تمہیں بہت سے ایسے کامیاب لوگوں کے متعلق بتاؤں گا جنہوں نے کامیابی کا سفر ناکامی کے جوتے پہن کر کیا تھا۔"

اپنی بات مکمل کر کے وہ دوبارہ سے میز پر پڑے کاغذات کو دیکھنے لگے۔ مرتضیٰ سر ہلا کر آگے بڑھ گیا۔

ڈرامیٹکس کے ہاشمی صاحب اپنی لمبی مونچھوں اور آدھے گنجے سر کے ساتھ واسع سے باتوں میں مصروف تھے۔ مرتضیٰ کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ اس کی واسع سے کوئی دشمنی نہیں تھی مگر نجانے کیوں اسے وہ بے حد برا لگنے لگا تھا۔ سعدی کی باتیں اس کی سمجھ میں آگئی تھیں مگر پھر بھی وہ اپنی ناکامی کی وجہ واسع کو ہی سمجھتا تھا۔

"پہلے کبھی ایکٹنگ کی ہے؟" ہاشمی صاحب اپنے مخصوص انداز میں پوچھ رہے تھے۔

"اسکول میں یا کالج میں۔ کوئی چھوٹا موٹا رول؟" ان کے استفہامیہ انداز میں ناگواری کی جھلک تھی۔

"اگر پہلے کبھی ایکٹنگ نہیں کی تو اب کیسے کرو گے؟"

اسے دونوں مرتبہ نفی میں گردن ہلاتا دیکھ کر وہ لہجے میں مزید ناگواری سمو کر بولے۔ مرتضیٰ کے چہرے پر بھی اسی قسم کے تاثرات چھلکنے لگے۔ وہ کچھ سوچ کر خاموش رہا۔ یہ جتانے کی ضرورت بھی کیا تھی کہ سر رضوی نے اس پلے کو کرنے کے لیے بصد اصرار اسے یہاں بھیجا تھا۔

"آزمانے میں کیا حرج ہے سر!" واسع نے انہیں کول کرنے کی کوشش کی۔

"رضوی اس کو recommend کر رہے ہیں تو آزمانا تو پڑے گا۔ بہرحال وہ بندہ بھی ٹیلنٹ کی ٹھیک ٹھاک پرکھ رکھتا ہے۔ ایسا ہے بچے ہم Samvel Beckett کا پلے Waiting for Godot اسٹیج کر رہے ہیں۔"

وہ اس کو پُرسوچ انداز میں گھورتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ مرتضیٰ کے فرشتوں نے بھی اس سے پہلے کبھی یہ نام نہیں سنے تھے۔ انگلش پلے کا نام سنتے ہی اس کا منہ تو کم دل بھی لٹک گیا۔ اس کا جی چاہا فی الفور انکار کر کے وہاں سے اٹھ جائے۔ جس چیز نے بے عزتی ہی کرنا تھا' اسے کرنے کا فائدہ بھی کیا تھا جبکہ ہاشمی صاحب مسلسل اسے گھورتے ہوئے مزید کہہ رہے تھے۔

"یہ ایک Absurd play ہے۔ مجھے یقین ہے تم نے اس قسم کا پلے پہلے کبھی دیکھا یا پڑھا نہیں ہو گا۔ خیر یہ کوئی ایسی انوکھی بات نہیں۔ یہاں بہت سے لوگوں کے لیے یہ چیز نئی ہو گی۔ اس میں تم جتنا Clumpsy نظر آؤ گے' اتنا ہی کامیاب ہو گے۔ تمہیں لکی کا کردار ادا کرنا ہے' ان ایکٹ کرنا ہے جو بڑا حاضر جواب اور مزاحیہ شخصیت کا مالک ہے۔ دوسرے ایکٹ میں dump ہو جاؤ گے۔ اصل اداکاری وہی ہے کیونکہ تب تمہیں ثابت کرنا ہو گا کہ خاموش رہ کر کیسے اداکاری کرتے ہیں۔ بنیادی طور پر تم ایک ظالم قسم کے لینڈ لارڈز کے غلام ہو۔ یہ سب باتیں میں تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ یہ پلے صرف چار کریکٹرز پر بیسڈ ہے۔ ہر کریکٹر بے حد اہم ہے اور مشکل بھی ہے۔ میں تمہیں اسکرپٹ دے رہا ہوں' اسے لے جاؤ۔"

انہوں نے ایک فائل اس کے سامنے میز پر رکھی۔ واسع لاتعلق بیٹھا تھا۔ اس نے دوبارہ ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

"میں تمہیں دو دن دے رہا ہوں' دو دن کے بعد یہ سارا اسکرپٹ یاد کر کے تم نے مجھے پرفارم کر کے دکھانا ہے۔ اس کے بعد میں فیصلہ کروں گا کہ تم یہ کر سکتے ہو یا نہیں۔ میرے پاس اس کریکٹر کو کرنے کے لیے بہت سے لڑکے ہیں۔ وہ تو رضوی نے تمہارے لیے کہہ دیا... چلو خیر۔"

انہیں احسان جتانے کا زیادہ ہی شوق لگ رہا تھا۔ مرتضیٰ کو بہت برا لگا۔ دل چاہا اسکرپٹ والی فائل ان کے سامنے پھینک کر کہے۔

"مٹی ڈالیں مجھ پر اور کسی اور لڑکے سے ہی کروا لیں یہ رول۔"

استاد کا احترام مانع تھا' سو وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر آ گیا۔

"یہ قادر تو نہیں کر پائے گا۔ دو دن میں اسے اپنے ڈائیلاگز ہی یاد نہیں ہوں گے۔" واسع کی آواز نے دروازے کے باہر تک اس کا تعاقب کیا تھا۔

"اس کا نام قادر ہے؟" ہاشمی صاحب نے پوچھا۔

"ایسی کی تیسی۔" مرتضیٰ ناک چڑھا کر بولا۔ اب یہ اس کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ بن گیا تھا۔ کالج ٹائم ختم ہونے کے بعد وہ ہاسٹل واپس آنے کی بجائے لائبریری چلا گیا۔ Absurd Plays کے متعلق بہت مشکل سے اسے دو ایک کتابیں مل سکی تھیں۔ انہیں ایشو کروا کر وہ واپس ہاسٹل آ گیا۔ اس میں سے ایک کتاب اس ڈرامے کی مکمل کہانی کا احاطہ کر رہی تھی۔ اس نے ڈکشنری کی مدد سے اسے پڑھنا شروع کیا۔ صد شکر کہ یہ ڈرامہ شیکسپیئر کے ڈرامے کی طرح بہت زیادہ لمبا نہیں تھا مگر بہرحال کسی بھی انگلش ڈرامہ کو اس طرح سے پڑھنے کا یہ اس کا پہلا تجربہ تھا۔ سوائے دقت ہو رہی تھی۔ جیسے تیسے کر کے اس نے شام تک وہ سارا پلے ایک مرتبہ پڑھ لیا تھا لیکن تب تک اس کے سر میں انتہائی درد ہونے لگا تھا اور اس نے کھانا کھانے کا تردد بھی نہیں کیا اور افسوس ناک بات یہ تھی کہ ڈرامہ اس کی سمجھ میں بھی نہیں آیا تھا۔

ہر چیز پر فاتحہ پڑھ کر وہ اٹھا۔ پہلے اپنے لیے چائے بنائی پھر آدھے درجن کیک رس کے ساتھ نوش فرما کر معدے کو آسرا پہنچایا۔ اس سارے عمل کے دوران واسع کی باتیں اس کے خون کو جلانے کا کام کرتی رہیں۔ سعدی آج کل کسی دوست کے گھر جا کر کمبائن اسٹڈی کر رہا تھا' سو اس کی واپسی رات کو ہوتی تھی۔ وہ واپس آیا تو مرتضیٰ نے اپنا دکھڑا رونا شروع کر دیا تھا۔

"Waiting for Godot by Samuel Backett" اس نے نام سن کر چند لمحے سر کھجانے میں صرف کیے۔

"ہاں میں نے پڑھا ہے یہ پلے۔ پر یار! مجھے یاد نہیں آ رہا۔" وہ بے چارگی سے بولا۔

مرتضیٰ نے اس کو اسکرپٹ والی فائل اور وہ دونوں کتابیں دکھائی تھیں۔

"ڈنر کر لیں پھر اس کے بعد دیکھتے ہیں۔" وہ ساری چیزیں چارپائی پر پھینک کر ڈائننگ ہال میں آ گئے۔ کھانا کھانے سے واقعی اسے اپنے اندر ایک نئی توانائی محسوس ہوئی تھی۔

کمرے میں واپس آ کر وہ دونوں واقعی پلے کی تیاریوں میں جُت گئے تھے۔ پہلے دو ایک صفحات پڑھ کر ہی سعدی کو یاد آ گیا کہ یہ کون سا پلے ہے۔

"یار! یہ چار بونگوں کا ڈرامہ ہے۔ جس میں سے ایک بونگا تجھے بنانا چاہ رہے ہیں ہاشمی صاحب' اس قسم کے ڈراماز میں مزاح حرکتوں سے پیدا کیا جاتا ہے۔ تم نے کبھی چارلی چپلن کا نام سنا ہے۔ بس تجھے چھوٹا موٹا چارلی چپلن بننا ہے۔"

وہ متفکر انداز میں اسے سمجھا رہا تھا مگر اس کے چہرے کی جانب دیکھ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا۔

"چارلی چپلن کا نہیں پتا تمہیں؟" وہ پوچھ رہا تھا۔ مرتضیٰ نے نفی میں سر ہلایا۔

"او بھلا ہو جائے تیرا... یار! تجھے کچھ پتا بھی ہوتا ہے۔" وہ ناگواری کا کوئی تاثر چہرے پر لائے بغیر بولا۔ اس کے بعد اس نے اپنی قمیص اتار کر دوسری چارپائی پر پھینکی اور چارپائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

"مجھے سردی لگتی ہے تو میرا دماغ زیادہ تیزی سے چلتا ہے۔" مرتضیٰ کو جواز پیش کر کے وہ اسے دوبارہ سے سمجھانے لگا۔ اس نے لکی کے سارے ڈائیلاگز ایک دفعہ سادہ انداز میں اسے ادا کر کے دکھائے تاکہ وہ تلفظ اور ادائیگی کے طریقے کو دیکھ لے۔ کافی دیر تک وہ اسے اس کھیل کے اسرار و رموز سمجھاتا رہا اور پھر تھک ہار کر وہ سو گیا مگر مرتضیٰ کافی دیر تک جاگ کر ڈائیلاگز یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ کافی دیر تک جاگنے کے بعد بھی وہ لکی کے ڈائیلاگز کا چوتھا حصہ یاد کر پایا تھا۔ سونے سے پہلے اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ اس کام کے لیے قطعاً "ناموزوں" ہے۔

☼ ☼ ☼

اگلی صبح اس نے بہت دن کے بعد نماز فجر ادا کی اور اسکرپٹ لے کر سر کانوں کو مفلر سے ڈھک کر گراؤنڈ میں آ گیا۔ اس نے پاؤں میں جرابیں جان بوجھ کر نہیں پہنی تھیں۔ وہ تجربہ کرنا چاہتا تھا کہ کیا واقعی سردی لگنے سے دماغ کی چستی پر فرق پڑتا ہے یا نہیں۔ ماربل کے بنچ پر بیٹھ کر اس نے ڈائیلاگز یاد کرنے شروع کیے تھے اور صرف بیس منٹ بعد ہی اسے احساس ہوا تھا کہ وہ ڈائیلاگز بالکل بھی

لکھا تھا جو اسے اسٹیج پر کرنا تھیں مگر اس عقل کے اندھے کو یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

"یہ رہی تمہاری کتاب۔" سر رضوی کی چہکار سنائی دی۔ وہ ایک کتاب لے کر اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئے لیکن اس سے پہلے کہ وہ کتاب کھلتی انہیں یکدم ایک اور بات یاد آگئی۔

"مرتضیٰ! میرے پاس اس پلے کی وڈیو ہے۔ میرا بھائی ہے نا وہاں یو کے میں۔ پی ایچ ڈی کر رہا ہے۔ اس نے مجھے بھجوائی تھی۔۔۔ تمہارا کام بن گیا بیٹا!"

وہ مرتضیٰ سے بھی زیادہ پرجوش ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنے کیبنٹ میں دوبارہ ایک دو ہاتھ مار کر ایک وڈیو کیسٹ نکال لی تھی۔

"یہ میں ہر کسی کو نہیں دیتا مگر تمہیں دے رہا ہوں۔ آج شام کو مجھے واپس کر دینا۔" انہوں نے وڈیو کیسٹ اسے تھماتے ہوئے کہا۔ وہ بے چارا کیسٹ ہاتھ میں لیے ان کے کیبن سے نکل آیا۔ ابھی دس قدم ہی چلا ہوگا کہ دوبارہ سر رضوی نے بلوا لیا۔

"مرتضیٰ! تمہارے پاس وی سی آر ہے؟" انہوں نے اس کی شکل دیکھتے ہی پوچھا اور پھر نفی میں جواب پا کر انہوں نے اسے ڈرامیٹک آرٹ کا آفس کھلوا کر وہ مووی دکھانے کا بندوبست کیا تھا۔ تکی نامی اس نیم پاگل ملازم کو ایک بار ہی اسکرین پر دیکھ کر اسے تسلی ہوئی تھی کہ وہ خوامخواہ گھبرا رہا تھا۔

"مرتضیٰ! ایکٹنگ کوئی دو گنا پہاڑہ نہیں ہے کہ جو بزرگ ہمیں تیار کر کے دے گئے تھے بس اسی کو ساری زندگی رٹنا ہے۔ یہ بہتا پانی ہے، اسے ہر لمحہ جدت کی ضرورت ہے۔ تم ٹی وی اسکرین پر نظر آنے والے اس تکی کو ذہن میں مت بٹھاؤ، بلکہ خود سوچو کہ تمہیں خود کو اس کردار میں کیسے ڈھالنا ہے۔ یہ سوچو کہ اگر تمہارا جابر لینڈ لارڈ تمہارے گلے میں رسی ڈال کر اس طرح سے لیے پھرے جیسے نامی [illegible] تکی کو لیے پھرتا ہے تو تم کس طرح پرفارم کرو گے۔ بے شک تمہیں ایک نیم پاگل کی طرح پرفارم کرنا ہے مگر تم اپنے ڈائیلاگز دیکھو کس قدر سنجیدگی لیے ہوئے ہیں۔ اس پلے کو اگرچہ سب Absurd play کہیں گے مگر تم اس کے ٹائٹل پر غور کرو۔ ویٹنگ فار گوڈو۔۔۔ غور کرو کتنی اہم تھیم ہے یہ۔۔۔ ہم سب کسی نہ کسی مسیحا کے انتظار میں ہی تو ہیں۔۔۔ تکی کے انتظار کو کس طرح پیش

مشکل نہیں ہیں۔ وہ کل بھی اپنے ڈائیلاگز کو اسی ہمت و حوصلے کے ساتھ یاد کر رہا تھا مگر کل وہ اسے یاد ہو کے نہیں دے رہے تھے اور اب وہ آنکھیں بند کر کے انہیں فرفر دہرا سکتا تھا۔

اسے دل ہی دل میں کافی خوشی ہوئی۔ آدھا مرحلہ تو سر ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

اس کام سے فراغت کے بعد وہ دوبارہ اپنے کمرے میں آگیا تھا۔ پہلے اس کا ارادہ تھا کہ کالج سے چھٹی کرے گا مگر پھر اس کا دھیان رضوی صاحب کی طرف چلا گیا۔

"انہوں نے میری صلاحیت پر بھروسا کیا ہے تو یقیناً میری مدد بھی انہیں ہی کرنی چاہیے۔"

یونیفارم پریس کرتے ہوئے وہ سوچ کر خود کو تسلیاں دیتا رہا تھا۔ کالج پہنچ کر پہلی کلاس لینے کے بعد وہ رضوی صاحب کے آفس پہنچ گیا۔

"اس میں اتنا پریشان ہونے والی کیا بات ہے۔ میں سمجھ سکتا ہوں، تمہیں ہاشمی صاحب نے پریشرائز کرنے کی کوشش کی ہے۔ تم ان کے خلوص پر شک مت کرو، وہ اپنے کام سے بے حد مخلص ہیں۔ دراصل خود بھی بہت اچھے اداکار ہیں۔ ٹی وی پر کافی عرصے اداکاری کرتے رہے ہیں۔ ابھی بھی کبھی کبھار نظر آجاتے ہیں۔ ان کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ پرفیکشنسٹ ہیں۔ شکر کرو انہوں نے تم سے اتنی بات کر لی ہے، ورنہ تو وہ ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں جن کی بیویاں خاموش رہ کر یہ دعائیں کرتی ہیں کہ وہ بولیں۔"

وہ اسے تسلی دیتے رہے تھے مگر وہ ان کے پاس صرف تسلی کی طلب میں نہیں آیا تھا۔

"مجھے ڈائیلاگز یاد ہیں۔ میں نے اپنے لہجے کو بھی امپروو کیا ہے مگر مجھے کس قسم کے جیسچرز شو کرنے ہیں مجھے بالکل سمجھ میں نہیں آرہا۔"

اس نے روہانسے لہجے میں انہیں اپنا مسئلہ بتایا۔

"تم مجھ سے زیادہ کام تو کر چکے ہو اب یہ تو اتنا بڑا مسئلہ ہے نہیں۔ اچھا ٹھہرو، مجھے چیک کرنے دو۔ میرے پاس اس ڈرامے کا پورا ٹیکسٹ ہے۔ میں تمہیں وہ دکھاتا ہوں۔"

وہ کرسی سے اٹھ کر پیچھے بنی الماریوں میں الٹے سیدھے ہاتھ مارنے لگے تھے۔ مرتضیٰ نے دوبارہ سے فائل کھول لی۔ اسکرپٹ میں واضح طور پر ان دو شخص کے بارے میں

کرو گے تم۔ جب یہ سب سوچ کر پرفارم کرو گے تو مجھے یقین ہے بہت اچھا پرفارم کرو گے۔"

سر رضوی نے اسے سمجھایا تھا۔ اتنا تو وہ لیکچر دیتے وقت نہیں بولتے تھے جتنا انہیں اب اس کے ساتھ بولنا پڑ رہا تھا۔

سعدی اور سر رضوی کی مہربانی سے وہ اس اسائنمنٹ کو مکمل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ مقررہ مدت پر اس نے ہاشمی صاحب کو ان کی منشاء کے مطابق کارکردگی رپورٹ پیش کر دی تھی۔ وہ متاثر ہوئے تھے یا نہیں مگر انہوں نے اسے سلیکٹ کر لیا تھا۔ یہ پلے دراصل گورنمنٹ کالج کے طلباء نے برٹش کونسل میں ماڈرن ڈرامہ کی ترقی و ترویج کے ایک سیمینار میں پیش کرنا تھا۔ پندرہ دن کے بعد یہ ڈرامہ اسٹیج پر پیش کیا جانا تھا اور ان پندرہ دنوں میں مرتضیٰ نے ہر چیز پس پشت ڈال کر اس ڈرامہ کی تیاری کی تھی۔

سیمینار والے روز ٹیچرز کے ساتھ منتخب طلباء ہی برٹش کونسل گئے تھے۔

"مجھے سب پر بھروسا ہے۔ تم سارا کھیل نہ خراب کر دینا۔"

ہاشمی صاحب اسے بار بار سمجھاتے رہے تھے۔ کاسٹیوم پہننے اور میک اپ کروانے تک وہ اس جملے کو سن سن کر تنگ آ گیا تھا۔ جب ڈرامہ پرفارم کرنے کی باری آئی تو وہ ہو گیا جو مرتضیٰ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اسے پہلی انٹری پر اتنی تالیاں سننے کو ملیں کہ وہ حیران رہ گیا۔ تالیوں کی یہ آوازیں اس میں جوش بھر رہی تھیں۔ "Waiting for Godot" نامی اس ڈرامہ میں بنیادی کردار چار تھے جس میں سے سب سے کم اہم کردار اس کے حصے میں آیا تھا مگر اس نے اپنی اداکاری سے اس کردار میں واقعی جان ڈال دی تھی۔

سر رضوی تو خوش ہوئے ہی تھے۔ ہاشمی صاحب نے بھی دل کھول کر داد دی۔ سیمینار کے بعد ڈنر تھا جس میں GC کے طلباء کو فوراً" بہت سے قابل لوگوں سے ملنے اور داد سمیٹنے کا موقع ملا۔

"ہیلو۔ آئی ایم ازیلیا!" کسی نے بہت گرمجوش لہجے اور سراہتی آنکھوں سے اسے مخاطب کیا تھا۔ گریس فل سی وہ لڑکی اسے بہت اچھی لگی کیونکہ اس نے نا صرف اس کی اداکاری کی تعریف کی' بلکہ اسے اس کی ایک دو خامیوں کے متعلق بتا کر بہت اچھی طرح سے گائیڈ کیا۔

"یہ GC کی اولڈ اسٹوڈنٹ ہیں۔ تھیٹر ڈائریکشن میں لندن سے ماسٹرز کر کے لوٹی ہیں۔ یہ اور ان کے شوہر دونوں ہی بہت ٹیلنٹڈ ہیں۔ GC کی پکچر گیلری میں ان کی بہت تصویریں ملیں گی تمہیں..... بہت اچھی اداکارہ ہیں۔ تھیٹر اور ٹی وی دونوں میں کامیابی سے کام کر رہی ہیں۔"

ہاشمی صاحب نے واپسی پر اسے بتایا۔

☆ ☆ ☆

"ہر جگہ سے وکس کے جیسی اسمیل آ رہی ہے۔" انکل صدیق کے سامنے سے ہٹتے ہی اس نے ناک پر ہاتھ رکھ کر گویا خود کلامی کی تھی۔ اس کے ساتھ وسیط کھڑا تھا وہ کچھ دیر اسے حیرانی سے دیکھتا رہا' پھر شاید اس کی عقل پر ماتم کرتے ہوئے بولا۔

"یہ کافور کی خوشبو ہے۔" یہ سن کر وہ اسی پوزیشن میں کھڑا رہا۔ وہ جانتا تھا یہ کافور کی خوشبو ہے۔ وہ اسی خوشبو کے تاثر کو زائل کرنے کے لیے ہی تو ادھر ادھر کی ہانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر لان میں آ گیا۔ شامیانہ تھوڑا کا جا چکا تھا۔ اکبر نے گھر میں موجود تینوں پیڈسٹل فین مختلف جگہوں پر رکھ کر چلا دیے تھے مگر گرمی زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ پنکھے کام نہیں کر رہے تھے۔ ہمسایوں کا ملازم بھی دو پیڈسٹل فین دے گیا تھا جو اسی سمت میں لگائے گئے تھے' جہاں خواتین میت کو گھیرے بیٹھی تھیں۔

اس نے وہیں کھڑے ہو کر اپنی ماں کو تلاش کرنے کی کوشش کی' وہ انہیں بمشکل ڈھونڈ پایا تھا۔ ململ کی سفید چادر اور سفید ہی چہرے لیے الجھے بالوں کے ساتھ وہ اب خاموش بیٹھی تھیں۔ ان کی آنکھیں اتنی سوجی ہوئی تھیں کہ ان کی لالی اسے دور سے ہی نظر آ رہی تھی۔ اس نے ماں کے چہرے سے نظر ہٹائی اور پھر خود بھی پیچھے ہٹ گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی ماں اس کی جانب دیکھے۔ اسے ڈر تھا کہ وہ اپنی ماں کی نظروں کا سامنا نہیں کر پائے گا۔ وہ ان کی جانب دیکھے گا تو اس پر جادو ہو جائے گا۔ وہ جادو اسے پتھر کا کر دے گا اور وہ پتھر کا نہیں ہونا چاہتا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ تو شروع سے ہی پتھر کا ہے۔ وہ الٹے قدموں پیچھے مڑا اور گیراج میں جا کھڑا ہوا۔ گیراج کے پچھلی جانب ایک واش روم تھا۔ جس کے سامنے پردہ لگا کر شاید میت کو نہلانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس نے نذیر کو اس پردے کے پیچھے ایک بڑا ٹب لے جاتے دیکھا۔ اس کا دل انتہائی زور سے دھڑکا تھا' اتنی زور سے کہ اسے اپنے کانوں میں دھڑکن کی آواز سنائی دی۔

اس نے دل کر سینے پر ہاتھ رکھا اور دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ ماموں عنایت اللہ اس کے باپ کے کسی دوست کے پاس کھڑے وفات کی وجہ بتانے کی کوشش کر رہے تھے' ان کی آوازیں اس کے کانوں تک آ رہی تھیں۔

"بس بھائی صاحب کیا بتاؤں..... ہفتہ پہلے میں مل کر گیا تو بھلے چنگے تھے۔ میرے ساتھ ایک ہی چارپائی پر بیٹھ کر روٹی کھائی۔ بیڈ پریشر (بلڈ پریشر) تھوڑا اوپر نیچے تھا مگر کسی کی پروا نہیں کرتے تھے۔ قیمہ آلو پر خوب نمک چھڑک کر کھایا' کہنے لگے۔ ڈاکٹرز جھوٹے ہوتے ہیں۔ میں بالکل بھلا چنگا ہوں اور سچی بات یہ ہے بھائی صاحب کہ واقعی بھلے چنگے لگتے تھے۔ یہ راتوں رات نجانے کس کی نظر کھا گئی۔ سارا مسئلہ خوراک کا ہے۔ انسان خوراکیں نہیں کھا رہا' خوراکیں انسان کو کھا رہی ہیں۔ سارا پرولم (پرابلم) ہی یہ ہے بھائی صاحب! اب زمین کی تاثیر پکی نہیں رہی۔ تیزاب ڈال ڈال کر فصلیں اگاتے ہیں لوگ۔" ماموں عنایت اللہ جھوٹ بولنے میں ماہر تھے۔

اس کے باپ کی موت سے وہ سفید تیلے اور کالا دال سنڈی کی موت تک ایک ہی سانس میں سب کہہ دینا چاہتے تھے۔ وہ کھاد کو تیزاب ہی کہتے تھے۔

"پرابلم خوراک کا نہیں' پرابلم تو کچھ اور ہے۔ وہ چیز کچھ اور ہے جو میرے باپ کو اندر سے کھا گئی۔"

اس نے دل میں سوچا اور ایکدم گزبڑا کر وہاں سے بھی ہٹ گیا۔ اس نے زندگی اب تک بہت موج میں گزاری تھی۔ اس کے لیے پریشانیاں ذرا مختلف طرح کی چیزیں تھیں' یہ ذہنی پریشانی اس کے حواس کو مفلوج کیے دے رہی تھی۔

"آپ کا فون ہے صاحب!" ملازم نے اس کے قریب آ کر کہا۔ ملازم کے چہرے پر حزن و ملال تھا اور اس کے لیے ترس بھی۔ اس کی حالت واقعی ایسی ہو رہی تھی کہ سب ترس کھاتے۔

"شینا بی بی کا فون ہے۔" ملازم نے اس کے پیچھے چلتے ہوئے گویا اسے خوش کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ ذرا تیز قدم اٹھا رہا تھا۔ یکدم سست پڑ گیا۔

"شینا کا؟" اس نے دوبارہ پوچھا۔ ملازم نے فقط سر ہلایا۔ سست روی سے قدم اٹھاتے وہ لاؤنج سے ہو کر دوبارہ اسی بیڈ روم میں آ گیا۔ وہاں ایک ایکسٹینشن تھا۔

"شینا! میرے فادر کی ڈیتھ ہو گئی..... کل رات..... نہیں..... آج صبح....." اس نے تصحیح کی۔ حالانکہ یہ غلط تھا۔ وہ جانتا تھا اس کا باپ دراصل کل رات ہی مر گیا تھا۔

"اوہ..... اٹس سیڈ..... آئی ایم سوری۔" وہ بے تاثر لہجے میں بولی' پھر اس نے فون بند کر دیا۔ اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا اور اگر ہوتا بھی تو وہ کیا کہہ سکتی۔ اسے اس کے ڈیڈی کی اجازت کے بغیر کچھ کہنے کی اجازت ہی نہیں تھی۔ اب کی بار وہ اس کمرے میں زیادہ دیر نہیں رکا تھا۔ اسے اس کمرے سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ فوراً" باہر آ گیا۔

میت کو نہلانے کی جگہ پر اب ایک بڑا تختہ' پیڑھا اور پانی والا پائپ آ چکا تھا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ اس کے باپ کو آخری آرام گاہ تک پہنچانے کے لیے تیزی سے تیاریاں مکمل ہو رہی تھیں۔ ہر شخص ہی متورم آنکھیں اور متحرک ٹانگیں لیے کام میں مصروف نظر آ رہا تھا۔ فقط وہی ایک فراغت کے حصار میں تھا۔ اس قدر فراغت کے باوجود اس نے ایسی تھکن کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ وہ اب کی بار تیز قدم اٹھاتا باہر آ گیا' جہاں اس کے تایا کھڑے تھے۔ وہ اس کے باپ سے عمر میں بڑے ہونے کے باوجود اتنے بوڑھے نہیں لگتے تھے' جتنا کہ اس کا باپ لگتا تھا۔ اپنے مخصوص آرام دہ دیہاتی لباس میں وہ دونوں بازو پیچھے باندھے کھڑے تھے۔ ان کے کندھے جھکے ہوئے تھے' اس نے انہیں مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی مگر اسے ان کے پاس کھڑے ہونے سے بہت ڈھارس ملی۔ تایا کو اس نے کبھی تمیز سے مخاطب کرنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی اور وہی تایا اس وقت اسے سب سے زیادہ اپنے لگ رہے تھے۔

"سارے انتظامات مکمل ہو گئے پتر؟" انہوں نے بہت دیر بعد اس کی جانب دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں جی..... نہلانے کی تیاری کر رہے ہیں۔" اس نے پیچھے مڑ کر دوبارہ اس عارضی غسل خانے کی طرف دیکھ کر جواب دیا' جیسے کسی انسان کی تدفین میں فقط نہلانا ہی انتظامات میں شامل ہو۔

"کس قبرستان میں دفنانا ہے؟" انہوں نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

وہ خاموش کا خاموش رہ گیا۔ اس متعلق اس نے سوچا ہی کب تھا۔

"نہیں... مجھے... مجھے تو کچھ نہیں پتا؟" وہ واقعی سٹپٹا کر بولا۔

"گاؤں لے جانے کا ارادہ تو نہیں ہوگا' سات گھنٹے کا سفر ہے... اتنی گرمی میں بہت مشکل ہے۔"

وہ نشن کی جانب دیکھ کر بول رہے تھے۔

"اپنی ماں سے پوچھ بیٹے... میں تو دیر سے پہنچا تھا... تم لوگوں نے تو کوئی انتظامات ہی نہیں کیے... میرے بھائی کو ہوا میں اڑانے کا ارادہ تو نہیں ہے نا۔"

وہ اپنے مخصوص انداز میں بولے تھے جبکہ وہ چکرا کر رہ گیا۔ اس نے تو کسی کام میں حصہ ہی نہیں لیا تھا۔ اس نے تو اتنی زحمت نہیں کی تھی کہ فون کرکے کسی کو اطلاع دے دیتا۔ سب کام صفدر اور ربیعہ وغیرہ نے کیے تھے۔ اس نے اپنے عقب میں دیکھا' وہ دونوں اسے کہیں نظر نہیں آئے۔ وہ ایک بار پھر تیچے کی جانب چلا تھا۔ اسے ان دونوں کو ڈھونڈنا تھا۔

"آپ کو ماں بلا رہی ہیں؟" اسے کسی نے دور سے مخاطب کرکے کہا۔ اس کے ماں باپ نے بہت سے لوگوں سے منہ بولے رشتے بنا رکھے تھے۔ اطلاع دینے والی لڑکی اسی منہ بولے رشتے کا استحقاق استعمال کر رہی تھی۔

"وہ کدھر ہیں؟" اس نے استفسار کیا اور پھر جواب پا کر وہیں چل دیا' جہاں سے اسے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اس ماں اسی بیڈروم میں اسے بلا رہی تھی جو کل رات سے پہلے تک اس کے باپ کا بھی ہوا کرتا تھا۔

☆ ☆ ☆

"گڑیو' منڈیو چیز وغیرہ لی لے جاؤ۔" اس معصوم سی پکار اس نے چڑ کر لحاف سر سے پیچھے کیا اور مندی آنکھوں سے بیٹھک کے دروازے کی جانب دیکھنے لگا۔ اصغر پچھلی گلی میں کھلنے والے دروازے میں کھڑا پوری قوت سے بج رہا تھا۔ وہ دروازے کے ایک پٹ کو تھامے کھڑا تھا جبکہ دوسری جانب سے بچوں کی فوج ظفر موج اندر داخل ہو رہی تھی۔

"شی... کسی نے رولا (شور) نہیں ڈالنا... بھائی مرتضیٰ آیا ہوا ہے۔"

وہ ٹیپ ریکارڈر کی طرح بجتے دعوت نامے کو روک کر اندر داخل ہونے والوں کو ہدایات بھی دے رہا تھا۔ مرتضیٰ نے جھنجلا کر لحاف کھینت کر علیحدہ کیا اور چارپائی سے نیچے ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ وہی بچے جو شور مچاتے' آوازیں کرتے اندر داخل ہو رہے تھے' اس کو بھنس بھنس چارپائی پر بیٹھا دیکھ کر دانت نکالتے' شرماتے اندر صحن کی جانب بڑھنے لگے۔ مرتضیٰ گاؤں کے بچوں کے لیے ایک اکھڑ اور مغرور مہاراجہ کی حیثیت رکھتا تھا جو اپنی مرضی سے بولتا تھا اور ناک چڑھا کر بے تحاشا ڈانٹتا تھا۔ ان میں سے بیشتر بچے مرتضیٰ سے پڑھنے کے لیے آتے رہے تھے۔

"اماں جی! یہ کام آپ شام کے وقت کر لیا کریں۔ اب بندہ یہاں سکون سے سو بھی نہیں سکتا۔"

وہ جھنجلایا' کھسیانا' روکھے بالوں میں انگلیاں چلاتا باہر صحن میں اماں جی کی چارپائی پر آبیٹھا۔ اماں جی نے نثار ہونے والی نظروں سے بیٹے کے چہرے پر پھیلی ناگواری کو دیکھا' پھر مسکراتے ہوئے سامنے پڑی تپائی پر رکھی کینوؤں کی ٹوکری میں سے ایک ایک اٹھا کر آنے والے بچوں کو تھمانے لگیں۔ ان کی نصیحتیں بھی ساتھ ساتھ جاری تھیں۔

کسی کو صاف ستھرا رہنے کے لیے کہہ رہی تھیں' کسی کو دھوئے کپڑے پہننے کے لیے فرمان جاری ہو رہے تھے جبکہ اکثریت سے ان کی ماؤں کے احوال دریافت کیے جا رہے تھے۔

"ان بلونگڑوں سے فارغ ہو کر میری بھی سن لیجیے گا۔"

وہ وہاں سے بھی جھنجلا کر اٹھا اور بیٹھک کے ساتھ والے کمرے میں آکر رنگین پایوں والے پلنگ پر دراز ہو گیا۔ سردیوں کی چھٹیاں ہوتے ہی وہ گاؤں آگیا تھا اور فطری بات ہے کہ اس کا دل لاہور کی گہما گہمی میں کہیں اٹک کر رہ گیا تھا۔ گزشتہ سات ماہ میں یہ اس کا تیسرا چکر تھا اور اس کا دورانیہ بھی لمبا یعنی ایک ہفتہ تھا اور وہ تیسرے ہی دن اکتا کر واپس جانے کے متعلق سوچنے لگا تھا۔

کالج میں پروموشن ٹیسٹ ہونے والے تھے۔ ان کی پریشانی بھی سر پر سوار تھی۔ اس کے علاوہ بھی وہ بہت سی سوسائٹیز کا ممبر بن چکا تھا۔ اس کی بہت سی سرگرمیاں تھیں جو اس کے ذہن کو متحرک رکھتی تھیں۔ یہاں گاؤں میں بیٹھ کر وہ ان کے متعلق سوچ ضرور سکتا تھا مگر کوئی عملی قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ حالانکہ یہاں اس کی بہت آؤ بھگت ہوتی تھی۔ بھائی بھابھی مہمان سمجھ کر بہت چاؤ چونچلے کرتے تھے جبکہ اماں اور ابا جی کی محبت تو تھی ہی شہد جیسی تھی' جس کی مٹھاس اسے محسوس ضرور ہوتی تھی مگر نجانے کیوں شہری گہما گہمی اسے ہر جگہ اپنی جانب کھینچ لیتی تھی۔

"تیرے ماسے نے کینوؤں کے ٹوکرے بھجوا دیے تھے' ان کی چھانٹی کرکے بچوں میں بانٹ رہی تھی۔ یہ کام بندے کو بھی تو ضروری ہوتے ہیں نا پتر! تجھے پتا ہے نا ہر سال سارا محلہ انتظار میں ہوتا ہے کہ بھینیوں کے گھر کینو آئیں تو سب جی بھر کر کھائیں' سب کو خبر ہے تیرے ماسے کے باغ ہیں۔ اتنا پھل آیا تھا ماشاءاللہ... ہم نے کیا کرنا تھا۔ پہلے سب کو گھر میں بھجوائے تھے پھر بچوں میں بھی بانٹ دیے۔ سب سے بڑا والا ٹوکرا تیرے لیے رکھ چھوڑا ہے۔ جاتے وقت لے جانا... میں تو فکر میں ہی رہتی ہوں' جہاں کہ میرا پتر وہاں ٹھیک سے کھاتا بھی ہوگا یا نہیں۔"

اماں جی ایک ہاتھ کمر پر رکھے دوسرے میں سرسوں کے تیل کی بوتل تھامے دھیرے دھیرے اندر چلی آ رہی تھیں۔ ان کے لہجے میں عجیب سی معذرت تھی جیسے بیٹے کی ناراضی کا بے حد احساس ہو۔ مرتضیٰ نے شرمندہ ہو کر ٹانگیں پیچھے کرکے ان کے لیے پلنگ پر جگہ بنائی۔

"تیرے بالوں میں تیل ڈال دوں۔ تجھے گرمی ہو گئی ہے کتابوں کی۔"

وہ اسے چمکار کر بولیں۔ مرتضیٰ ان کی دلیل پر مسکراتے ہوئے پلنگ سے اتر آیا۔ سرخ اینٹوں والا فرش بے حد ٹھنڈا تھا۔ پلنگ کے نیچے پیڑھا موجود تھا۔ اس نے اسے گھسیٹ کر باہر نکالا اور اس پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ اماں جی اس کے قدرے بڑھے ہوئے بالوں میں سرسوں کا تیل ڈال کر جھریوں بھرے ہاتھوں سے مالش کرنے لگیں۔ کتنے دن کے بعد ممتا بھرا لمس ملا تھا' اس لیے بے حد سکون محسوس ہوا۔

"مرتضیٰ! ایک بات کرنی تھی تجھ سے پتر!" اماں جی نے اپنے ہاتھ روک کر ڈرتے ڈرتے اس سے اجازت مانگی۔ اسے بے حد عجیب لگا۔ پیڑھے پر بیٹھے بیٹھے اس نے رخ موڑا اور ان کے چکنے ہاتھوں کو چومنے لگا۔

"اماں جی! آپ تو میری سہیلی ہیں' آپ کو مجھ سے بات کرنے کے لیے اجازت کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔"

اماں جی نے بہت دن کے بعد اپنے لاڈلے کے لاڈ دیکھے تھے۔ بے حد مسرور ہو کر انہوں نے اس کی پیشانی کو چوما۔

"پتر! میں تیری طبیعت سے واقف ہوں' اسی لیے تجھ سے یہ بات کر رہی ہوں۔"

مرتضیٰ نے ان کا اتنا سنجیدہ انداز پہلے نہیں دیکھا تھا۔ ان کے ہاتھوں کو ہاتھ میں لیے وہ بغور ان کی بات سننے لگا تھا۔

"بہت بچپن سے تو ایسا ہی ہے۔ اپنے بارے میں فیصلہ کرتے وقت سوچتا نہیں ہے پھر پچھتاتا ہے۔ تجھے آگے جانے کا شوق ہے اور اس چکر میں تو پیچھے والوں کو بہت پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ میری بات کو دھیج سے سنا مرتضیٰ! اللہ نے مجھے دو ہی اولادوں کو پالنے کی خوشی دی۔ میری آنکھوں کی روشنی ہو تم دونوں' میں نہیں چاہتی کہ یہ روشنی مجھ سے دور ہو بچہ!"

وہ بہت سوچ سوچ کر بول رہی تھیں۔ مرتضیٰ الجھ کر ان کی سمت دیکھنے لگا۔ اس نے اماں جی کے منہ سے ایسی باتیں پہلے کب سنی تھیں۔

اماں جی کے انداز میں جھجک سی تھی' جو مرتضیٰ کے تجسس کو بڑھا رہی تھی۔

"پتر! صفیہ بہت زور دے رہی ہے۔" ان کے ایک جملے نے ہی اس تجسس کے غبارے سے ہوا نکال دی۔ وہ جو ان کی جانب رخ کرکے بیٹھا تھا' فوراً سیدھا ہو گیا۔

"اونہہ... آج تک خالہ صفیہ نے زور دینے کے علاوہ آپ کو دیا ہی کیا ہے اور آپ کیا ہر ایک سے کچھ نہ کچھ لیتی رہتی ہیں۔ ان سے کہیں سنبھال کے رکھیں اپنی زور زبردستی اور نسرین بانو۔ ہمیں آلتو فالتو چیزیں جمع کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔"

وہ واقعی چڑ گیا۔ اماں جی منہ بسور کر اس کے سر پہ الٹے سیدھے ہاتھ مارنے لگیں۔ ان کے دل میں پہلے سے ہی خدشہ موجود تھا کہ وہ ان کی بات سن کر چڑ جائے گا۔

"اونہہ...! مجھے تو بھیجا قصائی سمجھتی ہیں جو پہلی بھینس نظر آئے گی' اسے ہی چھری پھروا دیں گی۔ آنکھوں کی روشنیاں ایسے اندھیروں پر قربان کی جاتی ہیں بھلا... بھائی کی دفعہ چاچے برکت کا زور تھا اور میری دفعہ خالہ صفیہ کی کمیٹی نکالنے کا ارادہ ہے۔ ارے بیٹے کوئی آسانی سے ملتے ہیں کہ بے کار چیزوں کی طرح ادھر ادھر پھینک دیے

جائیں۔"

اماں جی کے کمرے سے چلے جانے کے بعد بھی وہ جلتا کلستا رہا۔ جب تھک ہار گیا تو نہا دھو کر اباجی کے پاس چلا گیا۔ وہ آج کل زیادہ تر کھیتوں میں پائے جاتے تھے۔ سردی کی وجہ سے نرم گرم دھوپ کا مزہ لینے کے لیے وہ کھیتوں میں آجاتے تھے' یوں بھی ان کی صحت قابل رشک تھی۔ وہ بڑے بیٹے کے ساتھ ہر کام میں ہاتھ بٹاتے تھے۔ وہ اسے دیکھ کر کافی خوش ہوئے۔ وہ اسے کھیتوں میں دیکھ کر ہمیشہ ہی خوش ہوتے تھے۔ اتنی سردی میں وہ کاٹن کی دھوتی کے ساتھ کھدر کا کرتا اور اس کے اوپر جرسی پہنے حقہ گڑگڑانے میں مصروف تھے۔

"اوہ میرا شیر آیا... جے جی بلے... آجا میرا پتر۔"

دونوں بانہیں وا کر کے انہوں نے اسے خوش آمدید کہا۔ وہ کھلتی ہوئی زرد دھوپ کی سنہری سنہری خوشبو کو محسوس کرتا ان ہی کے پاس چارپائی پر آبیٹھا۔

"جب ایسی دھوپ میری زمین پر پڑتی ہے نا... میرا جی بہت خوش ہوتا ہے۔" اباجی اس کا کندھا تھپتھپا کر بولے۔ "دیکھ نا۔" انہوں نے اس کی عدم توجہی کو محسوس کر کے اس کی توجہ دوبارہ کھیت کی طرف مبذول کروائی۔ وہ زمین سے نکلتے ننھے منے پودے ہی دیکھ رہا تھا' مگر اباجی کی تسلی ہی نہیں ہو رہی تھی۔

"دیکھ یار!" اب کی بار پشت پر دھپ بھی پڑا۔

"دیکھ تو رہا ہوں... اب کیا مائیکرو اسکوپ لے آؤں۔" اس نے جھنجلا کر کہا۔

اباجی ہنس دیے۔ وہ جان بوجھ کر اسے تنگ کرنے کو بھی ایسی حرکتیں کیا کرتے تھے' وہ بھی ہنس دیا۔

"آپ کب بڑے ہوں گے اباجی!" اس نے ان کے معصوم چہرے کی جانب دیکھ کر پوچھا۔

"جب تو اباجی بن جائے گا۔" وہ مزے سے بولے۔ مرتضیٰ نے گہری سانس بھری۔

"اس کا مطلب ہے کہ دس پندرہ سالوں تک آپ کے بڑے ہونے کا کوئی چانس نہیں ہے۔"

"بیٹے پاگل نہ ہو تو... ایسی بات نہیں نکالتے منہ سے۔" انہیں حقیقتاً" برا لگا۔

مرتضیٰ چہرے پر مسکراہٹ لیے کھیتوں کی جانب دیکھتا رہا۔ اس کا دل چاہا وہ انہیں اپنی کامیابیوں کے متعلق بتائے' انہیں بتائے کہ وہ بہت اچھی اداکاری کی بنا پر آج کل بہت تعریفیں وصول کر رہا ہے مگر پھر کچھ سوچ کر خاموش رہا۔ انہیں اس کی باتیں سمجھ میں ہی نہیں آتی تھیں۔ وہ جتنی دلچسپی سے انہیں ایسی کوئی بات بتانے کی کوشش کرتا تھا' وہ اس سے کہیں زیادہ دلچسپی سے اس کی بات سن کر سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ایسے میں مرتضیٰ کو ان پر بہت پیار آتا۔ ساری زندگی کھیتی باڑی میں گزار دینے والے اس سادہ لوح انسان کے لیے جی سی اور اس میں پڑھنے والا ان کا بیٹا ایک جتنے مشکل تھے۔ کھیتوں کی جانب دیکھتے ہوئے اسے پتا ہی نہیں چلا تھا کہ کب اباجی نے اسے محبت پاش نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔

"تجھے نسرین واقعی اچھی نہیں لگتی؟" اباجی نے یکدم ہی پوچھا۔ اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ گھوم پھر کر یہی سوال بار بار اس سے پوچھا جا رہا تھا۔

"نہیں' میں جھوٹ بولتا رہتا ہوں... مجھے بہت اچھی لگتی ہے وہ... جھجز کے (چیگار ز)۔" وہ تڑخ کر بولا۔

"ہے نا... میں خود تیری ماں سے یہی کہہ رہا تھا کہ اپنا مرتضیٰ دل سے راضی ہے مگر شرماتا ہے' اس لیے صاف نہیں کہتا۔"

انہوں نے اطمینان بھری سانس خارج کی تھی۔

"اباجی! میں آپ کو بہت برا لگتا ہوں نا... آپ مجھ سے محبت نہیں کرتے نا۔" وہ انتہائی جذباتی لہجے میں بولا۔ اباجی تڑپ اٹھے۔

"پگلا... تو کیوں مجھے برا لگے گا... میرا اتنا سوہنا پتر ہے تو... منتوں مرادوں سے رو رو کر لیا تھا تجھے خدا سے۔ تیری ذرا سی بیماری سے میری جان نکل جایا کرتی تھی۔ جب تک تجھے پانچواں نہیں لگ گیا تھا' میرے دل کو دھڑکا ہی لگا رہتا تھا۔ تجھ سے پہلے تین اولادوں کو اپنی ہاتھوں سے دفنایا تھا۔ تیری باری تو ہمت ہی جواب دے چکی تھی۔ میرے سینے کی ٹھنڈک ہے تو غلام مرتضیٰ۔"

وہ انتہائی جذباتی لہجے میں کہہ رہے تھے۔ انہوں نے مرتضیٰ کو سینے سے لگا لیا تھا اور مرتضیٰ بھی جیسے اندر تک سرشار ہوا تھا۔ کھیتوں کے ساتھ ہی انہوں نے ایک کچا کمرہ تعمیر کر رکھا تھا جو گرمیوں میں اٹھنے بیٹھنے کے لیے کافی تھا۔ مصطفیٰ بھائی اسی کمرے میں بیٹھے تھے۔ وہ نجانے کیوں اٹھ کر باہر نہیں آئے تھے۔

"مرتضیٰ! ماں باپ اولاد کے دشمن نہیں ہوتے۔ اولاد سے زیادہ کسی کا اچھا نہیں سوچتے۔ ہم بھی تم

بارے میں اچھا ہی سوچتے ہیں۔ میں اور تیری ماں اسی لیے نسرین کی بات کرتے ہیں کہ وہ لڑکی تجھے سنبھال سکتی ہے۔ اپنی بچی ہے اور میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ..." وہ کچھ جھجکے۔

"وہ تیرے لیے... اچھے جذبات رکھتی ہے۔"

انہوں نے رک رک کر بات مکمل کی۔ اس زمانے میں ایسی بے دھڑک باتیں اتنے آرام سے کرنے کا رواج نہیں تھا۔

مرتضیٰ نے ان کے چہرے کی جانب دیکھا۔ نسرین اس کے لیے کیسے جذبات رکھتی ہے' یہ اس سے بہتر کون جان سکتا تھا۔

"اباجی! میں کسی خاص وجہ سے انکار نہیں کر رہا۔ مجھے ابھی ان جھنجٹوں میں نہیں پڑنا۔ ابھی تو میرا سفر شروع ہوا ہے اباجی! ابھی تو میری منزل بہت دور ہے۔ منزل تک پہنچنے سے پہلے اس قسم کے پڑاؤ مجھے مقصد سے ہٹا دیں گے۔"

وہ دھیمے لہجے میں بولا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ اس کا فلسفہ سن کر اباجی بھڑک اٹھیں گے۔

"یہ پڑاؤ نہیں ہے... یہ منزل ہے بیٹا... تو جتنی مرضی دور چلا جائے... واپس تو یہیں آنا ہے... تیری جڑیں تو یہیں ہیں نا... تیرا رزق اس جگہ سے وابستہ ہے میرے بچے' پڑھائی تیرا شوق ہے... شوق پورا کر کے واپس آجا۔"

وہ اس کی پشت سہلاتے ہوئے بہت پیار سے اسے سمجھا رہے تھے۔ اس نے چونک کر ان کی جانب دیکھا۔ وہاں وہی ازلی شفقت تھی جو ہمیشہ سے اس کے حصے میں آتی رہی تھی۔ اباجی جو کہہ رہے تھے' وہ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا اور جو کچھ وہ سوچتا تھا' وہ اس نے کبھی اباجی سے کہا نہیں تھا۔

"میری ایک بات یاد رکھنا پتر! زمین اڑیل گھوڑی کی طرح ہوتی ہے۔ لے پیار کی بہت طلب ہوتی ہے۔ جو اسے پیار کرتا ہے' سہلاتا ہے' اس کے لیے پسینہ بہاتا ہے' یہ اسے ہی پہچانتی ہے اور جسے یہ پہچانتی ہے' یہ اسی کی ہو جاتی ہے۔ زمین کی وفاداری حاصل کرنا ہو تو اسے توجہ دینا پڑتی ہے۔ میں نے اس زمین کو بہت توجہ دی ہے۔ یہ میرے ساتھ وفادار ہے۔ اس نے مجھے کبھی دھوکا نہیں دیا۔ یہی حال مصطفیٰ کا ہے' وہ اس کے لیے خون پسینہ ایک کر دیتا ہے تو یہ اسے سونے میں تولتی ہے مگر..." وہ لمحہ بھر کے لیے رکے۔

"مگر یہ تجھے نہیں پہچانتی مرتضیٰ! تو اس کے ساتھ وقت نہیں گزارے گا تو یہ اڑیل گھوڑی تیرے قابو نہیں آئے گی پتر!"

مرتضیٰ کے لیے ان کی باتیں بہت پریشان کن تھیں۔ وہ کبھی کھیتی باڑی کرنا ہی نہیں چاہتا تھا اور اباجی اسے کیا سبق پڑھا رہے تھے۔ اسے اپنی پریشانی میں اتنی فرصت بھی نہیں ملی تھی کہ وہ اباجی کو ان کے فلسفے کے لیے سراہ سکتا۔ وہ بہت گہری سوچ میں گم ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"اس کے بعد کیا کرو گے تم؟"

طلحہ نے بنیان سے جھانکتے ڈھولکی جیسے چھوٹے سے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سامنے دیوار کی جانب گھور گھور کر دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ سو دیوار پر زینت امان کی تصویر لگی ہوئی تھی جسے طلحہ نے کسی میگزین سے کاٹ کر چپکایا تھا۔ تصویر کے اوپر ایک کیل لگی تھی جس کے ساتھ کیلنڈر لٹکا ہوا تھا۔ جب کسی چھاپے کا خطرہ ہوتا تھا تو یہی کیلنڈر کھینچ کر نیچے کر دیا جاتا تھا اور یہ صرف اس لیے کیا جاتا تھا کہ مرتضیٰ کو کسی قسم کی وضاحت دینے سے خوف آتا تھا۔ وہ وارڈن چیچرے سے کافی ڈرتا تھا جبکہ طلحہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ گزرے دو سالوں نے ان سب دبو اور بزدل لوگوں کو کافی نڈر کر دیا تھا۔ فورتھ ایئر کب کی جا چکی تھی بلکہ اب تو وہ بھی کالج سے پاس آؤٹ ہونے والے تھے۔ سعدی کے چلے جانے کے بعد طلحہ نے مرتضیٰ کے کمرے میں الاٹمنٹ کروالی تھی۔ سعدی نے مزید پڑھنے کے لیے GC کا انتخاب نہیں کیا تھا بلکہ وہ بیرون ملک چلا گیا تھا۔ مرتضیٰ کی اس سے بہت دوستی ہو گئی تھی اور وہ اسے بہت یاد کرتا تھا۔ اس کا حلقۂ احباب اور سرگرمیاں بے حد پھیل چکی تھیں مگر وہ سعدی کو خط لکھنے کے لیے وقت ضرور نکال لیتا تھا۔ گریجویشن کے فائنل ایر کے ایگزام تقریباً" سر پر پہنچ چکے تھے۔ سو وہ سب ہی شرارتیں چھوڑ کر پڑھائی کے لیے سنجیدہ ہو چکے تھے۔ یعنی پہلے ایک گھنٹہ پڑھا کرتے تھے' اب ڈیڑھ گھنٹہ پڑھنے لگے تھے۔

مرتضیٰ کو ابتدا سے کتابیں رٹنے کی عادت نہیں رہی تھی۔ وہ بھی باقی لڑکوں کی طرح مخصوص اور اہم سوالات

امتحان سے ایک دن پہلے یاد کر لیتا تھا اور جنہیں یاد نہیں کر پاتا تھا وہ کمرہ امتحان میں ادھر ادھر سے پوچھ کر حل کر لیے جاتے تھے۔ سو پریشانی تو کوئی تھی ہی نہیں۔ ابھی بھی وہ طلحہ کے سامنے بیٹھا آئینہ ہاتھ میں لیے چھوٹی قینچی سے مونچھوں کی تراش خراش میں مصروف تھا۔ طلحہ کے سوال پر اس نے چہرہ دائیں بائیں جانب سے آئینے میں چیک کیا پھر خود کو سراہ کر بولا۔

"نہانے جاؤں گا۔" طلحہ نے قدرے اونچے ہو کر اس کے ہاتھ سے آئینہ چھین کر اس کے زانو پر زور سے مارا پھر ناک چڑھا کر بولا۔

"میرا مطلب تھا کہ بی اے کے بعد کیا کرو گے؟" مرتضیٰ کو پلاسٹک کے فریم والا آئینہ کافی زور سے لگا تھا۔ وہ زانو سہلا کر اسے گھور کر بولا۔

"تیرا قتل کروں گا کمینے!"

"تجھے ترس نہیں آئے گا میرے بچوں کو یتیم کرتے ہوئے۔ اتنے پیارے پیارے کیوٹ کیوٹ بچوں کے سر سے باپ کا سایہ چھینتے ہوئے تیرا دل نہیں دکھے گا۔"

وہ انتہائی چرب زبان اور بھلا کا ڈھیٹ واقع ہوا تھا۔

"تیری باتوں سے صاف پتا چلتا ہے کہ تو بی اے کے بعد بیاہ ہی کرے گا۔ ٹھکانہ ہو تو۔" مرتضیٰ کو حقیقتاً "ابھی تک یہ مرض نہیں لگا تھا۔ وہ اکثریت کی طرح لڑکیوں کے بارے میں گفتگو اور ان سے دوستی میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا جبکہ طلحہ تو اس فیلڈ میں پی ایچ ڈی کیے ہوئے تھا۔

"اس میں تجھے بچن والی کیا بات ہے۔ نکاح کرنا سنت ہے اور تم جانتے ہو میں بہت اچھا مسلمان ہوں۔"

"میں تجھے جانتا نہیں تمہیں۔ ہر داڑھی والے کو بنگلہ کہہ دیتے ہو۔ نماز تم عید کی بھی نہیں پڑھتے۔ جھوٹ ایسے بولتے ہو جیسے انسان سانس لیتا ہے۔" وہ اس کی خصوصیات گنوا رہا تھا کہ طلحہ نے بات کاٹ دی۔

"Will you shut up please" مجھ میں انکساری کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ میں اپنی تعریفیں سننا زیادہ پسند نہیں کرتا۔"

طلحہ بے نیازی سے بولا۔ مرتضیٰ بھی اس بے مزہ بحث کو بڑھانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ سو وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور الماری سے نہانے کے لیے کپڑے تولیہ وغیرہ نکالنے لگا۔

"تم ایم اے کرو گے؟" طلحہ نے ایک بار پھر اسے پکارا۔

"ہاں۔" اس نے الماری کے اندر جھانکتے ہوئے مختصر جواب دیا پھر اس کی جانب رخ کر کے بولا۔

"کیوں۔۔۔؟ تم نہیں کرو گے؟"

"اوں ہوں۔۔۔ ماسٹرز کر کے بھی مجھے سول سروس میں ہی جانا ہے۔ میرے ابا اور بھائی جو کر رہے ہیں میں بھی وہی کروں گا۔ پیپرز کے فوراً بعد اکیڈمی جوائن کر لوں گا پھر دن رات موٹی موٹی غیر دلچسپ کتابیں پڑھوں گا۔ انگلش اور اردو اخباروں کے اداریے پڑھوں گا انہیں اپنے لفظوں میں پروڈیوس کرنے کی کوشش کروں گا۔ جب تم جیسے ناکارہ اور معمولی لڑکے لاہور کی سڑکوں پر لڑکیاں تاڑنے میں مصروف ہوا کریں گے میں اپنے ابا کی کسٹڈی میں بورنگ انٹرنیشنل اور نیشنل افیئرز ڈسکس کیا کروں گا۔ اف کس قدر مشکل زندگی ہو گی یا اللہ۔۔۔ مجھے بی اے میں فیل کروا دے یا اللہ۔۔۔ مجھ غریب کی بھی سن لے۔"

مرتضیٰ نے بہت مشکل سے اس کی بات ہضم کی۔ اس کے بڑے بھائیوں سے وہ ایک بار مل چکا تھا۔ وہ واقعی کافی بارعب شخصیات کے مالک تھے لیکن طلحہ ان سے اتنا ڈرتا ہو گا، یہ اس نے نہیں سوچا تھا۔ اس کے ذہن میں اباجی کی نرم شخصیت اور بڑے بھائی کی حلیم طبیعت جگمگانے لگی۔

"میرے اباجی ایسے نہیں ہیں۔ انہوں نے کبھی مجھ پر کسی چیز کے لیے رعب نہیں ڈالا۔ میں اپنی مرضی سے یہاں پڑھنے آیا، سبجیکٹس بھی اپنی مرضی کے لیے اور۔۔۔" اب کی بار طلحہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"بھئی صاحب! آپ اپنی بات نہ کریں، آپ تو منتوں مرادوں والی اولاد ہیں۔ آپ کی آؤ بھگت نہیں ہو گی تو کیا ہم جیسوں کی ہو گی۔ ہم جیسے تو اگر معاشیات کے بجائے فائن آرٹس پڑھنا چاہیں تو ہمارے ابا آنکھیں نکالتے ہم پر چڑھ دوڑتے ہیں۔" وہ اب چارپائی سے ٹانگیں نیچے لٹکا کر بیٹھ گیا تھا۔

"مرتضیٰ! سنجیدگی سے بتاؤ، تم کیا کرو گے۔۔۔ کچھ تو سوچا ہو گا نا یا پھر اپنے اباجی کی طرح وہی زمینداری (کھیتی باڑی) کا ارادہ ہے۔"

طلحہ کے لہجے میں سنجیدگی اور طنز کی آمیزش تھی۔ مرتضیٰ نے چونک کر اس کی شکل دیکھی، اس کے ذہن میں اباجی کے کہے گئے جملے گونجے۔ اب تو وہ اکثر و بیشتر اسے یاد

دلواتے تھے کہ زمین اس کی منتظر ہے اور وہ نجانے کس حل کی تلاش میں تھا۔

"مجھے کبھی کبھی لگتا ہے کہ تم بہت آگے جاؤ گے۔ تمہاری تخلیقی صلاحیتیں بہت شاندار ہیں۔۔۔ اگر تمہیں ٹی وی پر یا فلم میں اچھے چانسز مل گئے تو پھر تمہیں مشہور ہونے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔"

وہ سادہ سے لہجے میں بولا تھا۔ مرتضیٰ نے اپنے دل میں جھانکا اور اسے پہلی بار لگا کہ جو اس کے دل میں ہے طلحہ نے اسی خیال کو زبان دے دی ہے۔ اس کے چہرے پر خوش کن مسکراہٹ پھیل گئی مگر وہ طلحہ کو ٹالنے کے لیے بولا۔

"پتا نہیں یار۔۔۔ میں نے اس کے متعلق کبھی نہیں سوچا۔۔۔ ابھی تو پیپرز دیتے ہیں۔ ایک بار گریجویٹ ہو گئے آگے کے متعلق اس کے بعد سوچیں گے۔"

کہنے کو اس نے بات ٹال دی مگر کاتب تقدیر نے شاید فوراً "وہیں کچھ نہ کچھ لکھ لیا تھا۔ اس کے بعد وقت سرپٹ گھوڑے کی طرح دوڑنے لگا۔ وقت کی فطرت میں بے وفائی ہے اور انسان اس قدر معصوم ہے کہ اس بے وفائی کو ہر حال میں برداشت کرنے پر مجبور ہے۔ یہ انسان کو اپنے شکنجے میں ایسے جکڑتا ہے کہ شاد و ناشاد سب کو اس کے پیچھے بھاگنا ہی پڑتا ہے۔ وہ سب بھی وقت کے پیچھے ایسے بھاگنے لگے جیسے معصوم بچے تتلیوں کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ انہی تتلیوں کا تعاقب کرتے وہ مزید دو سال آگے نکل آئے۔ کچھ ساتھی بی اے کے بعد بچھڑ گئے تھے اور جو رہ گئے تھے، وہ مضامین مختلف ہونے کی وجہ سے کم کم ملنے لگے۔

مرتضیٰ نے ان دو سالوں میں جی بھر کر کامیابیاں سمیٹیں۔ وہی غلام مرتضیٰ بھٹی جو واسع کے ہاتھوں ریجیکٹ ہو جانے کے بعد بے حد مایوس ہو گیا تھا، اب وہی غلام مرتضیٰ بھٹی کالج کا بیسٹ ایکٹر قرار دیا جاتا تھا۔ ڈرامیٹکس کے انچارج ہاشمی صاحب اسے اپنا دست راست قرار دیتے تھے۔ وہ کیا کام تھا جو مرتضیٰ نہیں کر سکتا تھا۔ ہر ایک کی نقل اتارنے سے لے کر ہر طرح کا گیٹ اپ اپنانے تک وہ ہر چیز میں ماہر تھا۔ گزشتہ دو سالوں میں اس نے کالج کے ہر پروگرام میں بہترین پرفارمنس دی تھی۔ وہ اس فیلڈ میں اتنا ایکسپرٹ تھا کہ اگر عین وقت پر کوئی لڑکا کوئی کردار ادا کرنے سے معذرت کر لیتا تو وہ کردار مرتضیٰ کو دے دیا جاتا وہ اسے بغیر ریہرسل بھی بہت مہارت سے ادا کر لیتا تھا۔

ایم اے فائنل ایئر میں سالانہ ڈرامہ کے لیے اس نے ایک زبردست آئیڈیا ترتیب دیا تھا جس کی دھوم بہت مچی تھی اور اس کے حصے میں بے حد ستائش آئی تھی۔

اس نے جارج برنارڈ شا کے پلے

"Arms and the Man"

کے کچھ حصوں کو پنجابی میں ڈب کر کے پیش کیا تھا۔ انگریزی ناموں والے سب کرداروں کا گیٹ اپ بھی پنجابی تھا۔ یعنی ہیرو دھوتی کرتے میں ملبوس جبکہ ہیروئن لاچے کرتے اور گھنگھروؤں والے پراندے میں قلانچیں بھرتی پھرتی تھی۔ مرتضیٰ نے اس ڈرامے میں ہیروئن رائنا کا کردار ادا کیا تھا۔

اس کے بعد اس نے ایک سنجیدہ پلے لکھا تھا جس کا نام "مرگ برگ" تھا۔ اس پلے میں اس نے اپنی تمام تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نا صرف ایکٹنگ کی بلکہ اس پلے کو بہت مہارت کے ساتھ کسی کی مدد کے بغیر اسٹیج پر پیش بھی کیا۔ اس پلے کی کہانی ایک ایسے شخص کے گرد گھومتی تھی جو زندگی کے مصائب کو بہت خندہ پیشانی سے برداشت کرتا ہے اور بہار کے انتظار میں ہر مشکل کا سامنا بہت ہمت سے کرتا ہے مگر جب بہار آتی ہے تو اس شخص کا انتقال ہو جاتا ہے۔ اس پلے میں اس نے مرکزی کردار ادا کیا تھا اور اب کی بار وہ سنجیدہ اداکاری میں بھی اپنا لوہا منوانے میں کامیاب رہا تھا۔ اس پلے کو جب اس نے اسٹیج پر پیش کیا تو اس کی دعوت اور پرزور فرمائش پر اباجی گاؤں سے یہ تماشا دیکھنے کے لیے آئے تھے۔ بیٹے کو ملنے والی ڈھیروں داد نے ان کا کئی لیٹر خون بڑھا دیا تھا لیکن جو چیز ان کے لیے تکلیف دہ تھی، وہ یہی تھی کہ ان کی نصیحتوں اور اصرار کے باوجود ان کا بیٹا شہر کو پیارا ہو چکا تھا۔ بلاشبہ وہ ان سے محبت کرتا تھا۔ ان کی وجہ سے اسے کبھی کوئی احساس کمتری نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنے بے حد امیر اور شہری دوستوں سے انہیں بہت افتخار سے متعارف کرواتا تھا مگر وہ گاؤں سے الرجک تھا اور وہ اس چیز کو چھپانے کی کوشش بھی نہیں کرتا تھا۔

فائنل ایئر کے ایگزامز میں کچھ دن رہتے تھے کہ سیالکوٹ سے طلحہ ملنے چلا آیا۔ وہ ایک بار سی ایس ایس Written میں ناکام ہو جانے کے بعد اب دوسری بار تیاری کر رہا تھا۔ زبیر اور آصف بھی گریجویشن کے بعد مزید

پڑھائی کا ارادہ ترک کر کے خاندانی کاروبار سنبھال چکے تھے۔ طلحہ نے فون کر کے انہیں بھی لاہور بلوا لیا۔
رضوان اور مرتضیٰ تو ایم اے میں بھی اکٹھے تھے جبکہ حبیب اور ربیط ان کے گروپ میں ایم اے میں ہی شامل ہوئے تھے۔ طلحہ کی آمد کی وجہ سے وہ سب ایک روز شاندار سا ڈنر اڑانے کے لیے مال روڈ چلے آئے۔ زبیر اور آصف کے علاوہ سب ہی کنگلے تھے' اسی لیے فنڈز چندہ جمع کر کے ایک چھپر ہوٹل میں کیا گیا۔ چنے کی بھنی خوب مرچوں والی دال کے ساتھ تندوری روٹیاں' اچار' سلاد اور تلی ہوئی مچھلی نے جشن کا سا سماں پیدا کر دیا تھا۔ ندیدہ ان میں سے کوئی بھی نہیں تھا مگر ہاسٹل کی پرانی عادت کے باعث خوب چھین جھپٹ ہوئی۔ مچھلی کے آخری قتلے پر تو وہ تماشا ہوا کہ سب مزدور لوگ جو اس چھپر ہوٹل میں کھانا کھانے آئے ہوئے تھے' اپنا کھانا روک کر ان سب کی جانب دیکھنے لگے۔ مچھلی کا وہ قتلا رضوان سے زبیر اور پھر مرتضیٰ کے ہاتھ سے ہوتا ہوا بالآخر طلحہ کے پیٹ کی زینت بنا تھا جس نے باریک کانٹوں کی پروا کیے بغیر وہ قتلہ نگل لیا تھا۔ سب سے آخر میں آر سی کولا چڑھایا گیا۔ اس کی دفعہ بھی یہی سب کچھ ہوا۔ طلحہ ان سب سے زیادہ پھرتیلا تھا' سو اپنی بوتل ختم کر کے اب وہ اس چکر میں تھا کہ کسی طرح ساتھ بیٹھے رضوان کی بوتل پر قبضہ کر لے۔
"میری بوتل کو ہاتھ مت لگانا۔۔۔ میں نے اس میں دو بار تھوکا ہے۔" اس کی عیاری بھانپ کر رضوان نے با آواز بلند اپنا کارنامہ بتایا تھا۔
"آخ۔۔۔ تھو۔۔۔ گندا۔" طلحہ نے اس کے کندھے پر زوردار دھپ رسید کی۔
"واہ رضوان۔۔۔ کتنا اچھا آئیڈیا آیا ہے تیرے ذہن میں اس کمینے سے اپنی بوتل بچانے کا۔"
کھانا کھانے کے بعد انہوں نے کھوئے والی قلفیاں کھائیں اور یہ طے ہوا کہ کچہری روڈ تک پیدل چل کر جایا جائے گا۔ ربیط کافی نازک اندام تھا مگر ان کے اصرار کے سامنے اس کی ایک نہیں چلی۔ وہ کچھ دیر چلتے پھر کسی فٹ پاتھ پر نشئیوں کی طرح بیٹھ کر لطیفے سنانے لگتے یا کسی پرانے واقعہ کو یاد کر کے ہنسنے لگتے۔ ایک کھوکے سے میٹھے پان خرید کر کھائے گئے۔ تیز بھاگتی ٹریفک کے شور میں ان کا ہلا گلا الگ ہی بہار دکھا رہا تھا۔ اکثر گاڑیوں میں بیٹھے لوگوں نے ان کے قریب سے گزرتے ہوئے حیرانی سے ان کی جانب دیکھا۔ ایک گاڑی میں بیٹھے شخص نے تو ازراہ مذاق ان کی جانب چند سکے بھی اچھالے' جنہیں خوش دلی سے قبول کیا گیا۔
"ہم ایک ہفتہ اسی سڑک پر اسی طرح لگا لو تو ریاض جانے کا کرایہ بہت آرام سے نکل سکتا ہے۔"
طلحہ نے زبیر کو مشورہ دیا تھا کیونکہ آج کل وہ مڈل ایسٹ جانے کے منصوبے بنا رہا تھا۔
"تم بھی میرے ساتھ بیٹھنا' تمہارے ولیمے کا خرچا بھی ہم یہیں سے پورا کر لیں گے۔" زبیر نے چڑ کر کہا تھا۔
"یار! پہلے اس کا بندوبست تو کر لو جس کی وجہ سے ولیمہ ممکن ہو گا۔ کمبخت نجانے کہاں چھپی بیٹھی ہے۔" وہ مصنوعی آہ بھر کر بولا۔
"آؤ یار! مل کر سوچتے ہیں کہ ہماری متوقع بیویاں اس وقت کیا کر رہی ہوں گی۔" یہ طلحہ کا پسندیدہ موضوع تھا۔
"میری والی تو آئن اسٹائن کے نظریات رٹ رہی ہوگی۔ اسے رات کے اس پہر بھی میری نہیں بلکہ آئن اسٹائن کی یاد ستاتی ہے۔"
ربیط ناک چڑھا کر بولا۔ وہ ان کے گروپ کا واحد منگنی شدہ تھا۔ اس کی منگیتر فزکس میں آنرز کر رہی تھی۔
"تم فکر مت کرو۔ آئن اسٹائن مر چکا ہے' سو تمہاری والی فقط اس کو یاد ہی کر سکتی ہے۔" حبیب نے اس کے شانے کو سہلا کر تسلی دی تھی۔
"میری والی اس وقت نماز عشاء ادا کر کے مصلے پر بیٹھی آیت کریمہ کا ورد کر رہی ہوگی اور رو رو کر مجھے خدا سے مانگ رہی ہوگی۔"
رضوان ان سب میں سب سے زیادہ شریف تھا مگر مردانہ خصلت سے مجبور تھا' سو موضوع میں اس کی دلچسپی فطری تھی۔
"اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ قرآنی آیت جس میں اللہ سبحان تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ۔ بے شک انسان شر کو بھی خیر کی طرح مانگتا ہے۔" میں تمہاری والی جیسے لوگوں کی طرف ہی اشارہ کیا گیا ہے۔"
آصف کو بھی بولنے کا موقع ملا تھا۔ رضوان کو موقع پر بھی موزوں جواب نہیں سوجھتا تھا' سو وہ خاموشی سے سب کے ساتھ ہنسنے میں شامل رہا۔
"یار! میری والی کیا کر رہی ہوگی۔۔۔ کمبخو! میرے متعلق

بھی تو سوچو۔" طلحہ شہزادے کی ایکٹنگ کر رہا تھا۔

"تمہاری والی کی لمبی زلفیں ہوں گی۔" زبیر نے آنکھیں گھمائیں۔ طلحہ کو لڑکیوں کے لمبے بال پسند تھے اور وہ اکثر کہتا تھا کہ وہ کسی لمبے بالوں والی لڑکی سے شادی کرے گا۔ زبیر کی بات سن کر طلحہ نے پوری بتیسی باہر نکالی تھی۔

"اور وہ اس وقت ان زلفوں سے موٹی موٹی جوئیں نکالنے میں مگن ہوگی۔" آصف نے زبیر کا ادھورا جملہ مکمل کیا تھا۔

"لعنت ہے بھئی!" طلحہ نے بدک کر کہا تھا۔ سب کا بلند و بانگ قہقہہ ابلا تھا۔ ٹریفک کی زبان ہوتی ہے مگر کان نہیں ہوتے' سو شور مچاتی چنگھاڑتی ٹریفک پہ اس قہقہے کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

"یہ مرتضیٰ سے بھی تو پوچھو۔" حبیب نے اتنا ہی کہا تھا کہ زبیر نے اس کی بات کاٹ دی۔

"اس سے مت پوچھو۔ اس کی تو کل پانچوں گھی میں ہیں۔"

"اس نے پانچ کر بھی لیں اور مجھے ایک کے متعلق بھی نہیں بتایا۔ مجھے ہاسٹل میں کہا کرتا تھا کہ اسلام میں صرف چار جائز ہیں۔"

بات کو کہاں سے کہاں گھما لے جانا طلحہ کی عادت تھی۔ ایک بار پھر زبردست قہقہہ پڑا۔ وہ چلتے چلتے اب ایک رہائشی کالونی میں آ گئے تھے۔ مین سڑک پیچھے رہ گئی تھی۔

"طلحہ سے کوئی بات مت کرو' اس کے بارہ بج گئے ہیں۔" مرتضیٰ نے جھینپ کر کہا تھا۔

"یہ سکھ ہے؟" زبیر نے مصنوعی حیرانی کو چہرے پر طاری کیا۔

"جی نہیں' سکھ نہیں' سکھ ہوں۔ اپنے والدین کا' بھائیوں کا' بہنوں کا اور اپنی گھر والی کا۔"

طلحہ نے خاموش رہنا نہیں سیکھا تھا۔

"خدا کا واسطہ طلحہ' گھر والی کے علاوہ بھی کسی موضوع پر بات کر لیا کر۔" آصف اسے شرمندہ کرنا چاہتا تھا۔

"یار! تجھے اپنی گھر والی کی باتیں سننا اچھا نہیں لگتا؟" وہ اتنی معصومیت سے بولا تھا کہ خود آصف شرمندہ ہو گیا۔

"تیری جو حرکتیں ہیں نا' وہ تجھے شرمندہ ہی کروائیں گی۔ شادی نہیں کروا سکتیں۔"

آصف خجالت سے بولا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ وہ وسیع و عریض اسٹریٹ سے گزر رہے تھے' جس کی دونوں جانب خوبصورت اور وسیع و عریض گھر بنے ہوئے تھے۔ گھر کے گیٹ پر بلب روشن تھے' سو ساری اسٹریٹ روشن مگر سنسان تھی۔ ان کی آوازیں اور بے فکری ہنسی خوب گونج رہی تھی۔

"مرتضیٰ! ہمیں اپنی اداکاری کا کوئی کمال تو دکھا دے۔" زبیر نے فرمائش کی تھی۔ اسے ان کے ساتھ واپس ہاسٹل نہیں جانا تھا بلکہ اس کے چچا کے نواسے کا عقیقہ تھا۔ سو اسے اس تقریب کے اختتام تک وہاں پر پہنچنا تھا۔ اس کی فرمائش پر مرتضیٰ نے چوں چراں کی تو سب اصرار کرنے لگے۔ وہ تیار ہوا تو نئی فرمائش کی گئی۔

"ایسا کرتے ہیں' ایک ڈرامہ کرتے ہیں۔ تم ایک لڑکی کا رول کرو جبکہ میں ایک اسمارٹ لڑکا بنتا ہوں۔"

"ہاں' اس میں مزہ آئے گا۔ یہ لڑکا تمہیں چھیڑے گا بلکہ ہم سب اس کار خیر میں حصہ لیں گے اور پھر تم ہم سے لڑائی کرو گے بلکہ کرو گی۔"

ہنسی ہنسی میں ہی پلاٹ تیار ہوا اور اداکاری شروع ہو گئی۔

مرتضیٰ ان سے دس بارہ قدم آگے تھا جبکہ وہ اس کے پیچھے سیٹیاں بجاتے آوازیں کستے آ رہے تھے۔ مرتضیٰ کی چال بالکل بدل گئی تھی۔ وہ نزاکت سے ٹھمک ٹھمک کر چل رہا تھا۔ اس کے پیچھے آنے والے نا صرف ہنس رہے تھے بلکہ مزے مزے کے جملے بھی کس رہے تھے۔

"تمہارے گھر میں ماں بہنیں نہیں ہیں؟" وہ یکدم رکا تھا اور آواز بدل کر بولا تھا۔

"ہیں جی۔ پہلے ہم سے تو بات کر لیں' ماں بہنیں بھی مل جائیں گی۔" یہ طلحہ کے سوا کون ہو سکتا تھا۔

"میں تمہارے منہ نہیں لگنا چاہتی۔" مرتضیٰ کی آواز پر بھی نسائیت غالب تھی۔

"گلے لگنا چاہتی ہو؟ بسم اللہ۔ بسم اللہ۔" طلحہ دونوں بازو وا کر کے آگے بڑھا تھا۔ سب پیچھے والوں کی ہنسی چھوٹ گئی۔ ان کا قہقہہ اتنا زوردار تھا کہ کسی گھر کے آگے کھڑے چوکیدار نے زوردار سیٹی بجائی تھی۔ وہ سب ہنس رہے تھے مگر مرتضیٰ ابھی بھی سنجیدہ تھا۔

"تم جیسے ذہنیت انسانوں نے عورت کی زندگی کو اس قدر مشکل بنا دیا ہے کہ وہ مشکل وقت میں بھی گھر سے باہر قدم نہیں رکھ سکتی۔ تمہیں ہری ہری سوجھ رہی ہے اور وہاں میرا باپ دمے کی وجہ سے سانس لینے سے بھی لاچار ہے۔ تم اپنا شوق پورا کر لو۔ جتنی مرضی آوازیں کسنی ہیں' کس لو۔ جتنی سیٹیاں بجانی ہیں' بجا لو۔ یہ سب تمہارا حق ہے کیونکہ اللہ نے تمہیں مرد بنایا ہے۔ تمہیں حق ہے کہ تم عورت کی جیسے چاہو تذلیل کرو۔ تمہارے دل میں اگر ایک انسان مر بھی گیا تو کیا ہوا' آخر اس دنیا میں بہرحال سب کو مرنا ہے۔ میرا باپ۔ مر بھی گیا۔ تو کیا۔ مر جانے دو۔ سب۔ کو۔"

اس کی آواز پر نمی غالب آ گئی تھی اور یکدم اس کی سسکیاں چاروں جانب گونجنے لگیں۔ مذاق ہی مذاق میں جو بات شروع ہوئی تھی' اس کا اختتام بے حد سنجیدہ تھا۔ مرتضیٰ نے چہرے پر دونوں ہاتھ رکھ لیے تھے جبکہ باقی چھ کے چھ ششدر اس کی جانب دیکھ رہے تھے۔

اچانک کہیں سے زوردار سیٹی سنائی دی پھر تالی بجانے کی آواز آئی تھی۔ مرتضیٰ نے چہرے سے ہاتھ ہٹائے' لمحہ بھر پہلے وہ سسکیاں بھر رہا تھا لیکن اب اس کی آنکھیں دور سے تو خشک ہی لگ رہی تھیں۔ تالیاں بجانے کی آواز تیز ہو گئی تھی۔

"ہیلو۔ ادھر۔ یہاں۔" تالیوں کے ساتھ کسی کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ زبیر نے سب سے پہلے اس طرف دیکھا تھا۔ وہ لوگ جہاں کھڑے تھے' اس والے گھر کے سیکنڈ فلور کے ٹیرس سے کوئی شخص ان کی جانب دیکھ کر ہاتھ ہلا رہا تھا۔ اس شخص نے ہاتھ ہلا کر انہیں رکنے کا اشارہ کیا۔

مرتضیٰ حیران ہو کر ان سب کی جانب آ گیا۔

"کمینے! ہمیں پھنسوانے دینا۔" حبیب نے دھیمی آواز میں کہا تھا۔

"پھنس بھی گئے تو کیا۔ کم از کم یہ تو پتا چلا کہ مرتضیٰ واقعی بہت زبردست اداکاری کرنے لگا ہے۔"

آصف نے گروپ میں سے سب سے پہلے اسے سراہا۔

"آج سے تم میرے استاد ہو۔" طلحہ نے اس کے قریب ہو کر اس کا ہاتھ تھاما۔ کچھ منٹ گزرنے کے بعد وہ شخص گیٹ کھول کر ان کے قریب چلا آیا۔

"مارولیس۔ میں نے تمہیں وہاں سے دیکھا اور دیکھا رہ گیا۔" اس نے ٹیرس کی جانب اشارہ کیا۔

"ابکجو ٹلی میں یہی اسٹیپ سے تم لوگوں کو بہت دیر سے واچ کر رہا تھا۔ مجھے تمہاری آواز تو واضح نہیں آ رہی تھی مگر دھیان لگانے سے کچھ ڈائیلاگ بہرحال سن پایا ہوں۔ بہت متاثر کیا ہے تم نے مجھے۔ کیا کرتے ہو۔ کبھی ایکٹنگ وغیرہ کے متعلق سوچا؟"

وہ واقعی بہت متاثر ہوا تھا۔ اس کی نگاہوں میں بے حد پسندیدگی تھی۔

"اچھا۔ GC میں۔ سوشیالوجی فائنل ایئر۔ ہاشمی صاحب کو تو میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ اچھا ٹھہرو۔ میں ابھی آتا ہوں۔ جلا مت۔" وہ شخص اتنا کہہ کر دوبارہ گیٹ کے اندر گھس گیا۔

"اے تے گھروں ای پے گیا اے۔" (یہ تو پیچھے ہی پڑ گیا ہے) رضوان نے سرگوشی کی تھی۔ چند منٹ بعد وہ دوبارہ واپس آ گیا۔

"یہ میرا کارڈ ہے۔ مجھے فون کرنا۔ میرا نام سید حسنین بخاری ہے۔ میں ڈرامے ڈائریکٹ کرتا ہوں۔"

وہ اپنا کارڈ مرتضیٰ کی جانب بڑھا کر بولا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہی کمرہ' وہی فرنیچر' وہی خوشبو اور وہی احساس۔

وہ کمرے سے باہر بھی ان ہی چیزوں کے سحر میں جکڑا تھا۔ کمرے کے اندر آ کر تو اسے لگ رہا تھا' دیواریں بھی اسے لعن طعن کر رہی ہیں۔ اس کی ماں بیڈ پر لٹنے پٹے انداز میں بیٹھی تھی۔

اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنی ماں کو مخاطب کر پاتا۔ بہت خاموشی سے وہ بیڈ کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ گود میں رکھ لیے اور یکایک اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ وہ بالکل ایسے بیٹھا تھا جیسے اس کا باپ بیٹھا کرتا تھا۔ اسے اپنے باپ کے انداز سے چڑ ہوتی تھی۔ ایسے جیسے انسان ہاتھ جھاڑ کر بیٹھ جائے۔ اسے لگتا تھا' یہ سستی ہے جبکہ آج اپنے باپ کے انداز میں بیٹھے ہوئے اسے احساس ہو رہا تھا کہ ہاتھ جھاڑ کر انسان سستی میں ہی نہیں بلکہ مایوسی میں بھی بیٹھ سکتا ہے۔

اسے اس طرح بیٹھا دیکھ کر اس کی ماں کے چہرے پر دکھ کے رنگ گہرے ہوئے تھے۔ وہ پھرتی سے اٹھیں اور دیوار گیر الماری کی جانب بڑھ گئیں۔ چند لمحوں بعد اس نے انہیں اپنے سامنے [illegible] وہ اپنی جگہ وہی تکتا رہا تھا لیکن جیسے ہی اس نے انہیں اپنی جانب آتا دیکھا تو نظریں چرا کر

اپنے ہاتھوں کی جانب دیکھنے لگا۔

اس کی ماں اس کے قریب چلی آئیں۔ انہوں نے اپنا ہاتھ اس کے سامنے کیا تھا۔ وہ چند لمحے ان کے ہاتھوں کی جانب دیکھتا رہا پھر نا سمجھی کے انداز میں اس نے ان کے چہرے کی جانب دیکھا۔

"یہ میری انگوٹھی ہے۔ ہزار پندرہ سو کی بک سکتی ہے۔ اس سے زیادہ روپے میرے پاس نہیں ہیں۔ اگر میرے پاس ہوتے تو میں تمہیں کچھ نہیں کہتی۔ کبھی بھی نہیں۔ وہ... مرنے والا... تمہارا باپ... تھا... وہ زندہ تھا تو تم نے... کبھی انہیں ان کا حق نہیں دیا۔ اب وہ نہیں رہے... اب ان کا کوئی حق نہیں رہا تم پر... مگر..."

وہ رونے لگی تھیں۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ اٹھ کر انہیں دلاسہ دیتا مگر شاید وہ دلاسہ دینے کا حق بھی کھو چکا تھا۔

"تم نے اسے ساری زندگی... بہت ذلیل کروایا ہے... تمہاری وجہ سے وہ... بہت ذلت سے گزرا ہے۔ اس نے وہ کام بھی کیے جو وہ نہیں کرنا چاہتا تھا... کبھی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا... میں نے اسے راتوں کو اس ذلت کی وجہ سے آنسو بہاتے دیکھا ہے... وہ شخص جو اپنے دکھ پر بھی حوصلے سے مسکراتا تھا... وہ تمہاری وجہ سے بہت رویا ہے... اب اس سے جان چھڑانے کے لیے ایک آخری مرحلہ باقی ہے... اس ایک مرحلے کے بعد تمہاری واقعی اس سے جان چھوٹ جائے گی۔ اس کی تدفین باعزت طریقے سے کروا دو... باہر... وہ سب لوگ جمع ہیں جو... اس... کی عزت... کرتے رہے ہیں۔ ان کی نظر میں اس کی جو عزت ہے' اسے سلامت رکھنا... اسے لاوارثوں کی طرح مت دفنانا... ایک ماں اپنے بیٹے سے کبھی اپنی پرورش... کی قیمت وصول نہیں کرتی... میں کرنا چاہتی ہوں۔"

اس نے "میں" پر زور دیا۔ اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔

"میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں... میرے شوہر کے ساتھ اب وہ سلوک مت کرو جو تم ساری زندگی کرتے رہے ہو... ان کی تدفین... اچھے طریقے سے ہونی چاہیے۔" اب وہ رونے کے ساتھ اس کے آگے ہاتھ بھی جوڑ رہی تھیں۔ اس نے خود کو پہلے سے زیادہ بے بس محسوس کیا۔

"آپ مجھ سے ایسے مت کہیں۔ آپ پلیز ایسے مت کہیں۔ آپ اپنی رِنگ اپنے پاس رکھیں۔ میں روپے کا بندوبست کر لوں گا۔ وہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے۔ دراصل... مجھے بالکل نہیں پتا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے' کہاں سے ابتدا کرنی چاہیے' کارپوریشن والوں کو ... کروں یا پہلے گورکن ڈھونڈنا چاہیے یا پھر کفن کے فیبرک لانا چاہیے۔ مجھے کچھ بھی نہیں پتا... مجھے واقعی کچھ نہیں پتا۔"

وہ لاچاری کے احساس میں گھر کر بہت روانی سے بول رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا اگر وہ کسی مقام پر رک جائے گا تو اس کے پاس بولنے کے لیے الفاظ ختم ہو جائیں گے۔ وہ ... رات کے بعد سے اب اپنی ماں سے بات کر رہا تھا۔

"تم اپنے ماما سے بات کرو... وہ تمہیں بتا دیں گے ... اپنے نایا سے... تمہارے بابا کی خواہش تھی کہ انہیں گاؤں میں دفن کیا جائے۔ جہاں ان کے بزرگوں کی قبریں دفن ہیں... وہ وہیں دفن ہونا چاہتے تھے... تم ان کی آخری خواہش کو پورا کرو گے نا...؟"

انہوں نے ایک بار پھر اس کے سامنے ہاتھ جوڑے تھے۔ اب کی بار وہ خود کو روک نہیں پایا تھا۔ اس نے ان ہاتھوں کو تھام لیا تھا۔ وہ کب سے اسی سہارے کی تلاش میں تھیں۔ اس کا دل چاہا' وہ انہیں گلے لگا لے مگر انہوں نے اس کے اندازے کے برعکس اپنے ہاتھ اس سے چھڑوا لیے پھر وہ اس کی جانب دیکھے بغیر باہر چل دی تھیں۔

"میں نے ایسا کیا کر دیا ہے جو یہ مجھ سے خفا ہیں۔ میں نے تو کچھ نہیں کیا۔"

حالانکہ وہ دل ہی دل میں جانتا تھا' ہر غلطی کرنے والا کہیں نہ کہیں اپنی غلطی سے واقف ضرور ہوتا ہے' ہر شخص کا اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے کا طریقہ مختلف ہوتا ہے۔ وہ بھی اپنے آپ سے نگاہیں چرائے باہر کی جانب چل دیا۔

"گاؤں لے جانا ہے تو پہلے بتانا تھا... میں تو کب سے منتظر تھا مگر تم منہ سے کچھ پھوٹتے ہی نہیں ہو... دیر والے ہیں... جلدی جلدی سارے کام نمٹانے ہیں... مجھے پہلے ہی ٹیلی فون کر دیتے تو میں وہاں رک جاتا مگر ... سے زیادہ اچھی بات کیا ہو سکتی ہے کہ ہم اس کو اس کے گاؤں میں دفنا دیں۔ کم از کم انسان روزانہ جا کر فاتحہ پڑھ سکتا ہے نا۔ تیری ماں کدھر ہے۔ مجھے اس سے بات کرنے دے۔"

ماموں عنایت اللہ اس کی بات سن کر جھنجلا کر بولے...

قصور ان کا نہیں تھا' تیزی سے چڑھتا ہوا سورج سب کے مزاج گرم کر رہا تھا۔ یہی ماموں پہلے کبھی اس سے اس لہجے میں بات نہیں کرتے تھے۔ باپ کی موت کا دکھ اپنی جگہ اور مزاج میں موجود رعونت اپنی جگہ۔

"میں اپنی ماں سے بات کر چکا ہوں... وہ پہلے ہی بہت اپ سیٹ ہیں۔ آپ براہ مہربانی انہیں مزید اپ سیٹ نہ کیجئے۔ میں خود ہی سب سنبھال لوں گا... تھینک یو سو مچ۔" وہ ناک چڑھا کر اپنے مخصوص انداز میں بولا۔

"اوئے پاگل! میری بات تو سنو... ایسا تو کچھ نہیں ہے۔" وہ اس کے مزاج سے واقف تھے' اسی لیے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنے لگے مگر اس سے پہلے ہی وہ دوبارہ سے اندرونی رہائشی حصے کی جانب بڑھ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

سید حسنین بخاری سے ہونے والی اس اتفاقیہ ملاقات نے اس پر کامیابی کا ایک اور در کھول دیا۔ ان دنوں پی ٹی وی سے جمعرات کی رات کو "تمثیل" کے نام سے ایک ڈرامہ سیریز چل رہی تھی جس میں مختلف رائٹرز کے لکھے ہوئے لانگ پلے نشر ہوتے تھے۔ بخاری صاحب آج کل اسی ایک ڈرامہ کے سلسلے میں مصروف تھے۔ انہوں نے اگلے دن فون کرنے پر اسے ایک مختصر مگر اچھا کردار آفر کیا۔ اسے ایک دیہاتی شخص کا کردار ادا کرنا تھا جو قسمت کی مہربانی سے زندگی میں ایک مرتبہ ہوائی سفر کا مزہ چکھ لیتا ہے۔ سارے پلے کے دوران اسے اسی ہوائی سفر کی شیخیاں بگھارنی تھیں۔ وہ کالج کے دوران اس سے کہیں زیادہ بہتر کردار ادا کر چکا تھا مگر ٹی وی کے لیے کام کرنے کا یہ پہلا تجربہ تھا' اس لیے وہ اس پیشکش کو رد نہیں کرنا چاہتا تھا اور اس نے کیا بھی نہیں۔ اسے اگلے ہی دن ریہرسل کے لیے بلا لیا گیا۔

ایگزامز میں کچھ ہی دن باقی تھے۔ اس صورت حال میں ریہرسلز اور پھر آؤٹ ڈور شوٹنگ میں مصروف رہنا کسی بھی طرح مناسب اقدام نہیں تھا۔

"کامیابی بار بار ایک ہی دروازہ نہیں کھٹکھٹاتی" ہی سوچ کر گونڈ کوئی نکل کر اس نے ہر چیز کو پس پشت ڈال کر بخاری صاحب کو ہاں کہہ دیا تھا۔ ہاسٹل میں سب ہی کتابوں سے کبڈی کھیلنے میں مصروف تھے' سو اس کی اس نئی سرگرمی کے متعلق کسی نے نوٹس نہیں لیا تھا۔ وہ سارا دن ریہرسلز میں مصروف رہنے کے بعد رات گئے واپس آتا اور تھک ہار کر سو جاتا۔ کہنے کو اس کا رول مختصر تھا مگر پھر بھی اس حصے کا کام مکمل کروانے میں اسے پچیس دن لگ گئے۔ پی ٹی وی پر کام کرنے سے اسے تھیٹر اور پی ٹی وی سے وہاں کا فرق سے آگاہی ہوئی اسے محسوس ہوا پی ٹی وی میں سب تماشا داد نہیں ملتی کیونکہ اداکاری کے جوہر دکھانے کے بعد ڈرامہ کے ٹیلی کاسٹ ہونے تک لمبا انتظار کرنا پڑتا تھا لیکن اس میں شہرت زیادہ تھی اور پروفیشنل ازم تھا۔ وہ جیسا ہر آرٹسٹک کام کی بنیاد تھا۔ بے شک اسے مزہ نہیں آیا تھا مگر سیکھنے کو بہت کچھ ملا تھا۔ پچیس دن کے بعد جب اس نے بخاری صاحب سے رخصت لی تو انہوں نے اس کا کندھا تھپتھپا کر کہا تھا۔

"تم میں ٹیلنٹ ہے بچے... اس کو ضائع مت کرنا۔"

بچہ پہلے ہی اس ٹیلنٹ کے بوجھ سے لوٹ موا ہوا جا رہا تھا۔ بخاری صاحب سمیت اس کے سینئر ساتھی اداکاروں نے بھی اس کی کافی حوصلہ افزائی کی تھی۔ اس ڈرامہ میں کام کرنے کے معاوضے کے طور پر اسے پانچ سو روپے کا چیک ملا تھا۔ اب تک اس نے فقط ستائش کے لیے کام کیا تھا۔ "معاوضہ" اسے پہلی بار ملا تھا۔ کسی نہ کسی طرح ہی سہی مگر اس کا شوق اس کا پروفیشن بن گیا تھا۔

افسوس ناک بات یہ تھی کہ اسے ایگزامز نہ دینے کا پچھتاوا نہیں تھا۔ اسے پتا بھی نہیں چلا تھا اور اس کا ایک شوق دوسرے شوق کو نگل گیا تھا۔ وہ گاؤں سے شہر اس کام کے لیے نہیں آیا تھا' بہرحال ابھی ایسا وقت نہیں آیا تھا کہ وہ پچھتاتا۔ اس کا خیال تھا' پچھتانے کے لیے ابھی لمبی عمر پڑی ہے۔ ایگزامز کا عرصہ ختم ہوا تو اسے ہاسٹل چھوڑنا پڑا اور پھر وہ ساہیوال واپس آ گیا۔

گاؤں میں اس کا استقبال ایسے ہی ہوتا تھا جیسے گرمی میں ٹھنڈی ہوا کا' لیکن اب وہ لمبے عرصے کے لیے آیا تھا بلکہ اس کے گھر والوں کا خیال تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے آ گیا ہے' سو کچھ دن کے بعد ہی اسے عام حیثیت مل گئی۔ اباجی کو خوش کرنے کے لیے وہ بھی سب کام خوش اسلوبی سے نمٹاتا رہا۔ مرغیوں کو دانہ ڈالنے' بھینسوں کا دودھ دوہنے' ٹریکٹر پر بیٹھ کر ہل چلانے اور اباجی کے حقے کی چلم بھرنے تک اس نے سب کام دوڑ دوڑ کر کیے مگر ہر گزرتا دن اس کی بیزاری میں اضافہ کر رہا تھا۔

اس روز وہ بھینسوں کا... وہ دو کی بالٹیاں پکڑے گھر کی

جانب آرہا تھا کہ سامنے سے ایک جانی پہچانی شخصیت آتی دکھائی دی۔ اس نے بہت حیرانی سے اس کی جانب دیکھا۔ چہرہ وہی تھا مگر چال ڈھال' انداز سب بدل چکے تھے۔ وہ اچنبھے سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔ وہ پہلے تو پریشان ہوئی پھر ناک چڑھا کر اس کے انداز پر برا مانا۔

"کیسی ہو نسرین؟" وہ ایک دم سے گڑبڑا کر بولا۔

"شکر الحمدللہ... تم کیسے ہو... یہیں رہنے کا ارادہ کرلیا ہے کیا؟" وہ سنجیدگی سے بولی تھی۔

"نہیں... ہاں... شاید... پتا نہیں..." اب کی بار وہ مسکرایا تھا جبکہ وہ مسکرائی بھی نہیں تھی۔ مرتضیٰ کا دل چاہا' وہ اس کی ہنسی کو دیکھ پاتا' وہ آگے بڑھ گئی۔

"کیا اب بھی یہ ہنستی ہوئی اتنی ہی بری لگتی ہے' جتنی پہلے لگا کرتی تھی... اونہہ... میں ایسے کیوں سوچ رہا ہوں... میری طرف سے بھاڑ میں جائے۔ نخرہ تو دیکھو... دو منٹ کھڑی ہو کر بات بھی نہیں کرسکتی۔"

وہ بڑبڑاتے ہوئے گھر کی جانب چل دیا لیکن دل ہی دل میں اس کایا پلٹ پر سخت حیران تھا۔ اسے حیرانی اس بات کی تھی کہ گاؤں میں ہی رہتے ہوئے وہ اس قدر تبدیل کیسے ہوگئی۔ رنگ روپ تو پہلے بھی اس کا اچھا ہی تھا مگر اب انداز اور رکھ رکھاؤ میں ایک وقار سا محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ گھر آکر بھی اسی پہیلی میں الجھا رہا' جس کا جواب نسرین ہی تھا مگر اسے یقین نہیں آرہا تھا۔

"خیر سے بارہ جماعتیں کرلی ہیں اس نے۔ اسکول میں استانی لگ گئی ہے۔ سوہنی تو پہلے بھی بہت تھی' اب تو ماشاءاللہ بہت ہی سوہنی ہوگئی ہے۔"

اماں جی شاید اس کی نظر میں اچھا تاثر جمانے کے لیے کچھ زیادہ ہی تعریف کرگئی تھیں۔

"اب اتنا جھوٹ بھی نہ بولیں... میں نے دیکھا تھا آج اسے... سوہنی ووہنی تو کوئی نہیں ہوئی... ہاں مگر ڈیسینٹ... خیر جانے دیں... آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔"

وہ ہمیشہ کی طرح ناک چڑھا کر بولا مگر دل ہی دل میں بے حد متاثر ہوا تھا۔ نسرین جیسی لڑکی کا بارہ جماعتیں پاس کرلینا اس کے لیے واقعی ایک بریکنگ نیوز تھی۔ اس کے بعد اماں جی کی اور اس کی اس متعلق کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ خود بھی — اس قسم کا لڑکا نہیں تھا کہ زیادہ دیر اس متعلق سوچتا رہتا۔ وہ تو خواب میں بھی اکثر یہی دیکھتا

تھا کہ ایک بڑا سا اسٹیج ہے' جس پر وہ کبھی کوئی کردار ادا کررہا ہے اور کبھی کوئی۔ اسے خواب میں بھی بے پناہ ستائش ملتی تھی جس کا نشہ اسے کچھ اور سوچنے ہی نہیں دیتا تھا۔

اس روز ایک عجیب بات ہوئی' مصطفیٰ بھائی کے سسرال میں فوتگی ہوگئی تھی' انہیں جانا پڑا۔ وہ اسے کہہ گئے تھے کہ "آج کی رات "موٹھی" کی فصل کو پانی لگانا ہے' یاد رکھنا۔" مگر وہ نجانے کیسے بھول بھال گیا۔ اباجی بھی مصطفیٰ بھائی کے ہمراہ گئے تھے۔ سوائے یاد دلانے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ اگلے روز جب مصطفیٰ بھائی آئے تو اس کی کوتاہی اور سستی پر اسے بے نقط سنا ڈالیں۔ بات اتنی بڑی نہیں تھی مگر نجانے کیسے بے وجہ ہی بڑھ گئی۔ وہ کمرے میں جاکر بند ہوگیا۔ اسے کچھ دنوں سے احساس ہورہا تھا کہ مصطفیٰ بھائی جان بوجھ کر اسے نیچا دکھانے کا بہانہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ ان کے رویے میں تبدیلی تو بہت پہلے سے آچکی تھی مگر اب تو جیسے وہ مکمل طور پر بھابی کے رنگ میں رنگے جاچکے تھے۔

"ڈانٹ سننے کے بعد جب اس کو رات کو پیاس لگی تو وہ پانی پینے کے لیے باہر صحن میں چلا گیا۔ بھائی کا کمرہ ساتھ ہی تھا' ان کے کمرے کے آگے سے گزرتے ہوئے نجانے کیسے اس کے کانوں سے بھائی کی آواز ٹکرا گئی۔ بھائی اور بھابی اسی کے متعلق باتیں کررہے تھے' سو مجبوراً" اسے دروازے سے کان لگانے پڑے۔

"میں نے اس زمین پر جان واری ہے تو یہ آج اس قابل ہوا ہے کہ ہم پر شہری پڑھائی کا رعب ڈال سکے۔ ہر مہینے جتنے روپے پیسے اس نے چاہے اس کو بھجوائے ہیں' مڑ کر بھی حساب نہیں لیا اس سے۔ سوچا تھا پڑھ لکھ جائے گا تو وہیں شہر میں کہیں کھپ جائے گا... سولہ جماعتیں تھوڑی نہیں ہوتیں... سولہ جماعتوں والے افسر بن کر گھومتے ہیں اور یہ دیلا نکما روٹیاں توڑنے کو یہاں آبیٹھا ہے۔ میں کیا ساری زندگی اس کا پیٹ بھرتا رہوں گا۔ مجھے اپنے بارے میں سوچنے کے قابل نہیں چھوڑا اس نے... اباجی اور اماں جی بھی اس کے لاڈ اٹھاتے نہیں تھکتے... سارے خاندان میں اس کی واہ واہ ہوتی ہے... کس کی وجہ سے؟ اوئے میری وجہ سے نا' جس نے خون پسینہ ایک کرکے اپنی کمائیوں سے اس کو اس مقام تک پہنچایا ہے۔"

بھائی کی آواز میں شعلوں سے زیادہ تپش تھی۔ وہ

بوجھل دل لیے وہاں سے ہٹ گیا اور پانی پیئے بغیر کمرے میں واپس آ گیا۔

"اباجی! میں شہر جا رہا ہوں۔۔۔ بہت دن ہو گئے۔۔۔ کوئی نوکری وغیرہ تلاش کروں‘ آخر سولہ جماعتیں یہاں گاؤں میں وقت برباد کرنے کے لیے تو نہیں کیں میں نے۔"

اگلے ہی روز اس نے اپنا ضروری سامان باندھ لیا تھا۔ اباجی تو حیران رہ گئے۔ شاید ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کا بیٹا لہلہاتی زمینیں چھوڑ کر شہر جا کر رزق تلاش کرنے کے متعلق سوچ سکتا ہے۔ اباجی اور اماں جی کو اس نے محبت سے سمجھا لیا تھا جبکہ مصطفیٰ بھائی کو کیسے سمجھائے‘ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کیونکہ ان کا اصرار سب سے زیادہ تھا۔ ان کی باتوں پر وہ بوجھل دل لیے مسکراتا رہا مگر ایک بار ارادہ کرکے توڑنا اسے پسند نہیں تھا‘ سو وہ شہر آ گیا۔

☼ ☼ ☼

"تم کدھر چلے گئے تھے کدھے۔۔۔ کوئی کانٹیکٹ نمبر تو چھوڑا ہوتا۔" ہاشمی صاحب اس کو اپنے آفس میں دیکھ کر مخصوص انداز میں بولے۔ وہ تو اچانک بغیر کسی منصوبہ بندی کے ان سے ملنے چلا آیا تھا۔ اسے امید نہیں تھی کہ وہ اس کا اتنا والہانہ استقبال کریں گے۔

"تم نے اپنا پلے دیکھا۔ پرسوں حسنین کا فون آیا تھا۔ بہت تعریف کر رہا تھا تمہاری۔۔۔ کہہ رہا تھا‘ اس لڑکے نے بہت اعتماد سے پرفارم کیا۔۔۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ پہلی دفعہ اداکاری کر رہا ہے۔"

وہ اسے خوش دلی سے سراہتے رہے۔ GC میں آج کل کانووکیشن کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ انہوں نے اسے بھی ازراہ مہربانی ایک پاس عنایت کر دیا۔ اسے دو ماہ ہو گئے تھے لاہور آئے ہوئے اور اسے یہ نہیں پتا تھا کہ اس نے جس پلے میں کام کیا تھا‘ وہ کب کا نشر ہو چکا ہے۔ آج کل وہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے فرنٹ ڈیسک پر استقبالیہ کلرک کے طور پر کام کر رہا تھا۔ ایک پرانے دوست کے ساتھ رہائش کا بھی عارضی انتظام ہو گیا تھا۔ وہ روپے کمانے کے لیے کبھی بھی بہت پرعزم نہیں رہا تھا‘ اس لیے ڈھائی ہزار ماہانہ کی نوکری جس میں دو سو روپے اسے فلیٹ کے ایک کمرے کے کرایہ کے طور پر دینے پڑتے تھے‘ اسے کافی اچھی لگ رہی تھی۔ ہاشمی صاحب سے ملاقات کے بعد وہ بہت دن تک ایک عجیب سی سرخوشی میں مبتلا رہا۔ اسے خوش کرنے کو یہ بات بھی کافی تھی کہ وہ ایک ٹیلنٹڈ آرٹسٹ ہے۔

اس روز ایک عجیب بات ہوئی‘ وہ ایک چیک آؤٹ کرنے والی فیملی کے بقیہ جات کا بل بنا رہا تھا۔ وہ فیملی جس میں ایک خاتون‘ ان کی دو بچیاں اور شاید بچیوں کا بھائی شامل تھے۔ وہ خاتون بغور اس کی جانب دیکھ رہی تھیں کیونکہ جب انہوں نے چیک ان کیا تھا تو استقبالیہ پر خاتون ریسیپشنسٹ موجود تھیں۔ ان کا آج پہلی بار مرتضیٰ سے واسطہ پڑا تھا۔

"آپ کو میں نے ٹی وی پر دیکھا ہے یا آپ کی شکل ایک اداکار سے بہت ملتی ہے۔"

وہ بغور اس کی جانب دیکھ کر بولی تھیں۔ اس کی جاب کی نوعیت ایسی تھی کہ اسے ہمہ وقت ایک پیشہ ورانہ مسکراہٹ کو چہرے پر سجانا پڑتا تھا۔ ان خاتون کی بات سن کر وہ لمحہ بھر کے لیے چونکا پھر اس کے چہرے پر موجود مسکراہٹ گہری ہوئی۔

"ہنی بیٹا! ادھر دیکھو۔ ہم نے ان کو ٹی وی پر دیکھا تھا نا‘ ایک لانگ پلے میں۔۔۔ ہے نا؟"

وہ بیٹی کو پکارنے کے ساتھ اس کی یقین دہانی بھی چاہ رہی تھیں۔

"یس مما۔۔۔ یو آر رائٹ۔۔۔ آپ بھولا ہو نا۔۔۔ بہت مزے کا ڈرامہ تھا آپ کا۔"

وہ بچی ماں کی پکار پر لپک کر آئی تھی۔ وہ سب اس کی تعریف کر رہے تھے اور وہ مسلسل شکریہ کرنے میں مصروف تھا۔ ان کے جانے کے بعد بھی بہت دیر تک سرور کی کیفیت اس پر چھائی رہی۔

تعریف سننا بہت کم لوگوں کو برا لگتا ہے اور اسے تو وہ شخص برا لگنے لگتا تھا جو دل کھول کر تعریف نہیں کرتا تھا۔ تعریف و ستائش اس کی صلاحیتوں اور ارادوں کو مزید جلا بخش دیتی تھی۔ اس کی جاب ٹھیک چل رہی تھی مگر اس کا شوق اور صلاحیت کہیں دب کر رہ گئی تھی۔

اس کے کچھ دن بعد ہاشمی صاحب کے ذریعے حسنین بخاری نے اسے پیغام بھجوایا۔ ریڈیو کے کسی پنجابی پروگرام کی میزبانی کے لیے خالص پنجابی سمجھنے والا کوئی شخص درکار تھا۔ انہوں نے اسے ریڈیو کے دفتر پہنچ کر کسی [illegible] سے ملنے کے لیے کہا۔ اس نے کبھی ریڈیو نہیں [illegible]۔ اسے

[illegible] کی آواز میں وہ کوالٹی محسوس نہیں ہوئی تھی جو کسی اچھے اسپیکر کی آواز میں ہونی چاہیے لیکن چونکہ حسنین بخاری نے کہا تھا‘ اس لیے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی [illegible] چلا آیا۔ ریڈیو پر کام کرنا اس کے لیے برا تجربہ ثابت [illegible]۔ اس کی آواز کی پچ واقعی بہت معمولی تھی اور اسے [illegible] سننے والوں میں وہ بہت نکما لگتا تھا مگر پھر بھی اس نے [illegible] کا وہ پروگرام کیا جس میں کسانوں کو موسم کے حساب سے کھیتی باڑی کے زریں اصول سکھائے جاتے تھے۔

یہ کام اس کے لیے بے موسم سبزی کے جیسا تھا مگر اس [illegible] نے اس کے اندر موجود پروفیشنل ازم کی کو پورا کر دیا۔ وہ ٹی وی اور تھیٹر کر چکا تھا۔ ریڈیو تیسرا میڈیم تھا [illegible] کے اسرار و رموز وہ بے دلی سے ہی سہی مگر سیکھ رہا تھا۔ اس کام میں ایکٹنگ کا مارجن کم تھا لیکن کہیں نہ کہیں [illegible] موجود ضرور تھی۔ اکثر اوقات کوئی زرعی ماہر وقت [illegible] پہنچ پاتا تو اسے خود ہی "کسان" نامی اس پروگرام میں مہمان و زرعی ماہر بننا پڑتا تھا۔

دوسروں کی آواز نکالنے کی خصوصیت یہاں اس کے کام آ رہی تھی۔ ان دنوں ٹی وی تیزی سے ترقی کر رہا تھا لیکن ریڈیو کی حالت بھی پتلی نہیں تھی۔ ریڈیو کے ساتھ اچھی فہم و فراست کے لوگ وابستہ تھے‘ اسی وجہ سے ریڈیو بھی سنا جاتا تھا۔ اس کے ہوٹل میں چونکہ یہ بات پتا تھی کہ وہ ایک آرٹسٹ ہے‘ سو اسے اس کے پروگرام کی ٹائمنگز میں آسانی سے چھٹی مل جایا کرتی تھی۔ اس پروگرام کے اسے ڈیڑھ سو روپے ماہانہ مل رہے تھے۔ اسے لگنے لگا تھا کہ اس کی تخلیقی صلاحیتیں ماند پڑ رہی ہیں مگر اپنے شوق کی تسکین کا کوئی ذریعہ یا حل اسے نہیں سوجھ رہا تھا۔ کسی سے جا کر کام کیسے مانگتے ہیں‘ یہ طریقہ اسے آتا نہیں تھا اور اگر آبھی جاتا تو وہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ خود کو اداکار سمجھتا تھا‘ بھکاری نہیں۔ خودداری اور عزت نفس اس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

انہی دنوں GC میں اولڈ راوین کے ساتھ کوئی تقریب منائی جا رہی تھی۔ وہ چونکہ ایم اے ہی نہیں کر پایا تھا‘ اس لیے اسے انوائٹ کیے جانے کے امکانات کم تھے لیکن ہاشمی صاحب اسے ہمیشہ یاد رکھتے تھے۔ سو اس نے بھی یہ تقریب اٹینڈ کی۔ وہاں بہت عرصہ بعد اس کی سعدی سے بھی ملاقات ہوئی۔ ان دونوں کی خط و کتابت کم ضرور ہوئی تھی مگر ختم نہیں ہوئی تھی۔ اسے سعدی سے ملنا بہت اچھا لگا۔ اس نے سعدی کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ فائنل ایئر کے ایگزامز نہیں دے پایا تھا۔ سعدی کو اگر یہ پتا چل جاتا تو اسے بے نقط سنانی تھیں۔ وہ بہت مختصر وقت کے لیے آیا تھا۔ اسے تقریب کے اختتام سے پہلے واپس چلے جانا تھا‘ اسی لیے وہ ایک دوسرے کے ساتھ تفصیلی بات بھی نہ کر سکے۔ سعدی کے جانے کے بعد ہاشمی صاحب اسے کسی سے ملوانے لگے۔

"ارے بھئی ان سے ملو۔۔۔ اجوکا کا نام سنا ہے کبھی؟"

وہ اپنے سامنے کھڑی پروقار سی خاتون کی جانب دیکھ کر کہہ رہے تھے۔ مرتضیٰ نے اجوکا کا نام پہلے نہیں سنا تھا مگر وہ ان خاتون سے بخوبی واقف تھا بلکہ وہ پہلے نا صرف ان سے مل چکا تھا بلکہ بات بھی کر چکا تھا۔

"اجوکا ایک تھیٹر گروپ ہے اور ان کا ایک واضح نصب العین ہے۔"

ہاشمی صاحب تعارف میں تعریفی جملے شامل کر رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

اجوکا تھیٹر گروپ میں کام کرنا اس کے لیے ایک بے حد دلچسپ تجربہ ثابت ہوا۔ اس نے تھیٹر کے مزید اسرار و رموز سیکھے‘ تجربہ حاصل کیا اور ستائش پائی لیکن جو چیز حاصل نہ ہو سکی‘ وہ روپیہ تھا۔ اجوکا کے پلیٹ فارم سے بہت سنجیدہ سوشل ایشوز پیش کیے جاتے تھے‘ اس نیے پبلک میں ابھی یہ اتنا مقبول نہیں تھا۔ واہ واہ سے دل و دماغ تو سیر ہو سکتے ہیں مگر پیٹ صرف روٹی سے بھرتا ہے‘ سو جلد ہی مرتضیٰ ایک بار پھر پریشان رہنے لگا۔

اس کی وہی جاب چل رہی تھی مگر اب اس کی تنخواہ ڈیلی ویجز کی بنیاد پر ملنے لگی۔ تھیٹر کے شوق میں اسے ہفتے میں ایک آدھ بار چھٹی کرنی پڑ جاتی تھی جس کی وجہ سے اس کی تنخواہ کٹ جاتی تھی اور پھر تھیٹر میں اسے روپے تو خاک ملنے تھے‘ خود اس کے اپنے روپے چھوٹی موٹی چیزوں کی مد میں خرچ ہو جایا کرتے تھے۔ اس نے جو پلاٹ لے رکھا تھا‘ اس کی قسط بھی ہر ماہ جمع کروانی ہوتی تھی۔

اس روز وہ کسی کو ایکٹر سے اسی سلسلے میں بات کر رہا تھا کہ شاہد صاحب نے سن لیا۔ وہ ٹی وی کے اچھے اداکار تھے۔ ان کی والدہ بھی تھیٹر سے وابستہ رہی تھیں اور اب بھی ٹی وی کے لیے کام کر رہی تھیں۔ انہوں نے اسے

اپنے پاس بلایا اور اس کا انٹرویو کرنے لگے۔ وہ انہیں GC کے زمانے سے جانتا تھا۔
"دیکھ بچہ! شوق اور پروفیشن کبھی ایک نہیں ہونا چاہیے کیونکہ شوق کا تعلق دل یا روح سے ہے جبکہ پروفیشن کا تعلق جسم اور پیٹ سے ہے۔ اگر تو پیٹ بھرے گا تو دل خالی ہوگا اور اگر دل کی سنے گا تو بھوک سے مر جائے گا۔ تیرا پرابلم یہ ہے کہ تجھ میں ٹیلنٹ ہے اور تجھے اس ٹیلنٹ کا احساس بھی ہے۔ اب یہ احساس تجھے سکون نہیں لینے دیتا... مگر۔"
وہ لمحہ بھر کے لیے رکے اور مخصوص انداز میں اس کی جانب دیکھا۔
"تعلیم تیری کم ہے۔ خاندان تیرا غریب ہے۔۔۔ اگر تو صرف یہ سوچ لے کہ میں اداکاری کروں گا اور میرے ابا مجھے من و سلویٰ فراہم کرتے رہیں گے تو یہ ناممکن سی بات ہے' اس لیے تماشے کو تماشا سمجھ' کوئی دھندا شروع کر اور کبھی کبھی دل کی تسکین کے لیے یہاں وہاں آتا جایا کر۔۔۔ پڑا کچھ پلے کہ نہیں۔"
ان کی باتیں حقائق پر مبنی تھیں مگر اس کا منہ لٹک گیا۔ جاب بھی اسے آسانی سے نہیں ملی تھی۔ کافی خوار ہونے کے بعد وہ اس ہوٹل میں نوکری حاصل کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ اسے اس قسم کی خواری سے بہت ڈر لگتا تھا۔
چند دن مزید اسی پریشانی میں گزر گئے۔ اس روز وہ ریڈیو اسٹیشن سے نکل کر سامنے کھوکھے سے سگریٹ لے رہا تھا کہ مکرم مل گیا۔
"یار! تو اسموکنگ کرنے لگا ہے؟" مکرم بھی ایک چھوٹا موٹا اداکار تھا جو کام حاصل کرنے کے لیے صلاحیت سے زیادہ چاپلوسی پر یقین رکھتا تھا۔
"ہاں۔" اس کے سوال کا مرتضیٰ کے پاس یہی جواب تھا۔ حالانکہ وہ اپنی جیب میں سگریٹ صرف اس لیے رکھتا تھا کہ اس کا روم میٹ منتظر رہتا تھا کہ وہ اس کے لیے سگریٹ لائے گا۔
"ہوٹل کیسے چل رہی ہے۔۔۔ اور پھر زندگی کیسی گزر رہی ہے؟)"
سگریٹ کے کش فٹافٹ لگاتے ہوئے اس نے بات برائے بات کی غرض سے پوچھا۔ مرتضیٰ اسے زیادہ منہ لگانے کی ضرورت نہیں سمجھتا تھا' سو اس نے ہاتھ اور منہ سے "سب اچھا ہے" کا اشارہ کیا۔
"اچھا میں چلتا ہوں۔۔۔ مجھے آڈیشن کے لیے جانا ہے۔ یعقوب بابر صاحب آج کل اچھے لڑکوں کی تلاش میں ہیں۔"
مکرم کے منہ سے نجانے کیسے پھسل گیا۔ حالانکہ ٹی وی کے لوگ ایسی باتیں اتنی آسانی سے ایک دوسرے کو نہیں بتاتے تھے۔ مکرم تو اتنا کہہ کر اپنی راہ چلا گیا جبکہ مرتضیٰ سوچ میں پڑ گیا۔
"آڈیشن دینے میں کوئی حرج تو نہیں ہے۔" اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا تھا۔ یعقوب بابر پی ٹی وی کے پرعزم اور حوصلہ مند نوجوان ڈائریکٹرز میں سے ایک تھا۔ مرتضیٰ نے آڈیشن دیا تھا اور اس کی قسمت اس آزمائش میں کامیاب ہو گئی تھی۔ یعقوب بابر نے مرتضیٰ کو اجوکا کے کسی ڈرامے میں پرفارم کرتے دیکھا تھا' سو وہ اس کی صلاحیتوں کے معترف تھے۔
یعقوب بابر کا یہ میگا سیریل مرتضیٰ کا ہی نہیں بلکہ پی ٹی وی لاہور مرکز کی تاریخ کا ایک یادگار سیریل ثابت ہوا تھا۔ اس سیریل میں بھی اس کا لیڈنگ رول نہیں تھا لیکن وہ سپورٹنگ رولز بھی خوشی سے ادا کرتا تھا اور یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ وہ جیسا بھی کردار ادا کرتا تھا' اسے خوب پذیرائی ملتی تھی۔ اس سیریل کی کامیابی نے مرتضیٰ کے لیے بہت سے بند دروازے کھول دیے تھے۔ اسے پی ٹی وی پر بکثرت کام ملنے لگا۔ اس نے گریجویشن کی بنیاد پر بینک میں جاب کے لیے اپلائی کر رکھا تھا لیکن شوٹنگ کی ڈیٹ کی وجہ سے وہ انٹرویو بھی نہ دے پایا۔ ہوٹل کی جاب ابھی بھی چل رہی تھی جبکہ پی ٹی وی پر بھی روپے مل ہی جاتے تھے۔ وہ تھیٹر کے لیے بھی کبھی کبھار وقت نکال ہی لیتا تھا جس سے اس کے شوق کی تکمیل بھی ہو جاتی تھی۔
شہرت کس چڑیا کا نام ہے' یہ مرتضیٰ کو دراصل سب سمجھ میں آیا تھا۔ جب کہیں آتے جاتے اسے لوگ پہچان لیتے اور اس کے کسی کردار کا نام لے کر اسے بلاتے تو اسے بے حد خوشی ہوتی۔
اندر سے وہ واقعی ایک معصوم اور بے ضرر سا انسان جو اپنے کام سے کام رکھتا تھا جسے الٹے سیدھے شوق بھی نہیں تھے۔ اس کی شہرت اور کام کا لوڈ ایک ساتھ بڑھ رہا تھا اور اس کے طرز معاشرت میں بھی تبدیلی آرہی تھی۔ اسی دوران ابا جی گاؤں میں کافی بیمار پڑ گئے تو اسے گاؤں آنا پڑا۔ دو تین مہینے بعد وہ چکر تو لگا لیتا تھا اور اس نے مصطفیٰ بھائی

کے ساتھ تعلقات بھی نہیں بگاڑے تھے۔ ابا جی کی طبیعت کچھ گری گری رہنے لگی تھی لیکن اس کو دیکھ کر وہ بہتر محسوس کرنے لگتے تھے۔ گھر میں ٹی وی آچکا تھا' سو اس کی کامیابی گھر والوں کے لیے کوئی نئی خبر نہیں تھی۔ اسے اس کی شہرت کی وجہ سے گاؤں میں بھی رعایتی مارکس ملا کرتے تھے۔
نسرین نے اب تک شادی نہیں کی تھی اور ابا جی مرتضیٰ سے اب شادی کے لیے کہنا چھوڑ چکے تھے۔ مرتضیٰ کو ابا جی سے بہت محبت تھی اور نسرین سے محبت تو نہیں تھی لیکن وہ اسے بری نہیں لگتی تھی۔ اتنی چکا چوند والی زندگی میں بھی اس کی زندگی میں کوئی عورت نہیں آئی تھی۔ سو ابا جی کے ایک ہی بار دوبارہ کہنے پر اس نے نسرین سے شادی کے لیے ہامی بھر لی تھی۔ اس نے اس شادی کے لیے ایک شرط رکھی تھی۔
"ابا جی! میں نسرین سے تب ہی شادی کروں گا جب آپ میرے ساتھ شہر چل کر رہیں گے۔"

☆ ☆ ☆

"یہی بہتر ہے۔" تایا جی اس کی بات سن کر بھیگے لہجے میں بولے تھے۔
"میں خود تجھ سے یہی کہنا چاہ رہا تھا مگر۔۔۔" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔ یہ نہ کہہ سکے کہ تجھ سے اور تیرے نخروں سے ڈرتا تھا' اس لیے پہلے یہ بات نہیں کی تھی۔
"سب سے پہلے میت کے لیے ٹھنڈی گاڑی کا انتظام کر۔۔۔ وہ جو لکڑی کا بکسا بناتے ہیں جس میں فوجیوں کی لاشیں بھیجی جاتی ہیں۔۔۔ ویسا بکسا بنوا لے۔ اپنی گڈی ہو تو اب سفر اتنا لمبا نہیں رہا۔۔۔ بس کے ذریعے جاؤ تو پھر مشکل ہوتی ہے۔۔۔ دس بجے ہیں۔۔۔ عشاء تک دفنا دیں گے۔۔۔ ہائے میرا بھائی۔"
انہیں بات کرتے کرتے بھائی کی یاد آگئی تھی۔ اس نے ان کی باتوں سے جو پہلا اندازہ لگایا تھا' وہ یہ کہ اسے میت لے جانے کے لیے ٹرانسپورٹ کا انتظام کرنا ہے اور اس کے لیے پیسے درکار تھے۔ پیسے کہاں سے اور کیسے آجاتے ہیں' یہ اس کے سوچنے کی بات پہلے کبھی نہیں تھی۔ وہ بس اپنے باپ کے پاس پہنچ جاتا تھا اور دو لفظوں سے ان سے رقم کا مطالبہ کر دیا کرتا تھا۔ اب نہ باپ رہا تھا اور نہ ہی فی الحال اس میں وہ ہونس تھی کہ کسی سے بھی جا کر یوں پیسوں کی بات کرنے لگتا' وہ اپنے بیڈروم میں آگیا۔ اس کے والٹ میں فقط پانچ سو روپے کا ایک نوٹ تھا۔ کل صبح ہی اس نے باپ سے پانچ ہزار روپے لیے تھے جس میں سے صرف پانچ سو بچے تھے۔
"ان پانچ سو روپے سے تو سی این جی کا خرچا بھی پورا نہیں ہوگا۔" اس نے دل ہی دل میں سوچا اور یہ پہلی مرتبہ تھا کہ اس نے پیسے کو خرچ کرنے سے پہلے کچھ سوچا تھا۔
وہ پانچ سو روپے کا نوٹ ہاتھ میں لیے کچھ دیر اسی طرح اپنے کمرے میں کھڑا رہا۔ اس نے باپ کے علاوہ کبھی کسی سے پیسے نہیں مانگے تھے۔ جس طرح وہ اپنے باپ سے پیسے مانگتا تھا' اس طرح کسی اور سے تو نہیں مانگے جا سکتے تھے۔ وہ ذہن میں ان دوستوں کے نام دہرانے لگا جن سے وہ پیسے مانگ سکتا تھا۔
مکرم' طیب' علی' نعمان۔۔۔ اس نے سب سے پہلے طیب کو فون کیا تھا۔
"اوہ! اٹس سیڈ۔۔۔ یو نو اٹس ریئلی سیڈ۔۔۔ فادر کے بغیر زندگی بہت مشکل ہو جاتی ہے نا۔۔۔ مگر یو ڈونٹ وری یار۔۔۔ تم بہت اسٹرونگ ہو۔۔۔ تم نے اپنے ڈیڈ کے بغیر سروائیو کرنا سیکھا ہوا ہے۔۔۔ تمہیں کیا مشکل ہو سکتی ہے۔ تمہارے لیے پیسوں کا بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تمہارے ڈیڈ اتنا کماتے تھے۔ انہوں نے تمہارے لیے اتنا چھوڑ دیا ہے کہ تمہیں نیکسٹ کوئی پرابلم نہیں ہوگی۔ غم جتنا بڑا ہو' بہرحال برداشت کرنا پڑتا ہے اور پھر صبر کر دیا۔۔۔ مرنا تو سب کو ہے۔ آج وہ چلے گئے' کل ہماری باری ہے۔"
وہ اس کی پوری بات سنے بغیر شروع ہو گیا تھا۔ اسے پہلی مرتبہ طیب کی مادہ پرستی پر غصہ آیا۔ حالانکہ وہ خود بھی انتہا کا بیفکر لیسنگ ۔۔۔ واقع ہوا تھا۔
طیب کا انداز دیکھ کر اسے ہمت نہیں ہوئی کہ وہ اس سے ادھار کے نام پر کچھ رقم مانگ سکتا۔ یہ وہی طیب تھا جسے وہ ہمیشہ قرض دے دیا کرتا تھا اور بھول جاتا تھا۔
"دوست ہی دوست کے کام نہ آیا تو دوستی کا فائدہ۔" وہ اپنے باپ کے سامنے ہمیشہ کہا کرتا تھا' جب بھی وہ اسے لالچی دوستوں سے دور رہنے کا مشورہ دیتا تھا۔
اگلا فون اس نے علی کو کیا تھا۔ اسے ابھی تک یہ اطلاع نہیں ملی تھی' وہ ابھی تک سویا ہوا تھا۔ اس کی آواز پر نیند غالب تھی۔
"فادر کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔۔۔ رات تک تو بھلے چنگے

تماشے کرتے پھر رہے تھے... یار! یہ بھی کوئی نیا تماشا تو نہیں ہے نا... اچھا جا تازہ کتنے بجے ہیں...؟ میں بہت تھکا ہوا ہوں... کوشش کروں گا کہ پہنچ جاؤں۔"

اس نے اتنا کہہ کر فون بند کر دیا۔ مکرم نے اسے سب سے زیادہ دکھ پہنچایا۔ اس کی بہن نے فون اٹھایا تھا اور چند لمحے بعد مکرم کی تفصیلی آواز سنائی دی۔

"یار! تم نے لینڈ لائن پر کیوں فون کیا ہے... سی ایل آئی پر تمہارا نمبر آ رہا ہے۔ میرے پاپا پہلے ہی اس بات پر غصہ کرتے ہیں کہ میں تمہارے ساتھ کیوں گھومتا پھرتا ہوں۔ تمہارا نمبر انہوں نے دیکھ لیا تو ان کا پارہ ہائی ہو جائے گا... وہ پہلے ہی مجھے ٹوکتے رہتے ہیں کہ تماش بینوں جیسے دوست کیوں بنا رکھے ہیں... تم جانتے ہو نا وہ کس چیز سے الرجک ہیں... تمہارے فادر کا سوشل اسٹیٹس ہی اتنا چیپ ہے... آئی ایم سوری یار... ابھی تم فون بند کر دو... میں تمہیں جم میں شام کو ملتا ہوں۔"

مکرم پر اسے سب سے زیادہ بھروسا تھا۔ وہ خود کو بہت براڈ مائنڈڈ اور ماڈرن کہتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ تمام انسان برابر ہیں اور کوئی امیر غریب نہیں ہوتا۔ وہ سب دوستوں میں برملا کہتا تھا۔

"یار! میرا باپ گدھا ہے جو کلاس ڈس کریمینیشن پر یقین رکھتا ہے... مجھے ایسی باتوں سے نفرت ہے۔"

اور یہی مکرم اب اسے اتنی حقارت سے دھتکار رہا تھا۔ اس نے آج تک اپنے ماں باپ یا رشتہ داروں کو اہمیت ہی نہیں دی تھی۔ اس کے لیے اس کے دوست جن میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل تھے، اہم تھے لیکن ضرورت پڑنے پر یہی دوست اس کی مدد نہیں کر رہے تھے۔

اسے پہلی مرتبہ بہت کچھ محسوس ہو رہا تھا۔ آج کے دن اس کی زندگی میں اتنا کچھ پہلی مرتبہ ہو رہا تھا کہ اسے لگنے لگا تھا، وہ اس دنیا میں پیدا ہی آج ہوا ہے۔ ابھی کچھ اور دوست بھی باقی تھے لیکن اس میں ہمت نہیں تھی کہ ان کی دوستی کو آزماتا۔ یعنی یہ طے ہوا کہ کبھی کبھی صرف وہ شخص مصیبت میں نہیں ہوتا جسے آزمایا جا رہا ہوتا ہے بلکہ کبھی کبھی وہ شخص زیادہ مصیبت میں ہوتا ہے جو آزما رہا ہوتا ہے۔

"اب میں کیا کروں؟" اس نے سن ہوتے ذہن کے ساتھ سوچا تھا۔

☼ ☼ ☼

دوستوں سے مایوس ہو کر وہ اپنے کمرے میں آ کر ویلیو ایبلز کو چیک کرنے لگا۔ اس کا لگژری بیڈروم ہر کی لگژریز سے آراستہ تھا۔ ٹی وی کمپیوٹر، سپلٹ اے روم ریفریجریٹر، بیش قیمت فرنیچر، ایرانی قالین ہر ایک سے بڑھ کر ایک تھی۔ لیکن کیا وہ یہ سب چیزیں رقم حاصل کر سکتا تھا۔ اور وہ بھی اس صورت حال میں جب کہ اس کا باپ باہر اپنے آخری سفر کے آخری مراحل کے پورے ہو جانے کا منتظر تھا۔

ایک مرد ان حالات میں اپنے حواسوں کو کنٹرول میں رکھتا ہے۔ خاص طور پر ایک بے حس مرد کو موت وغیرہ جیسی باتوں سے فرق نہیں پڑتا اور وہ تو ایسا مرد تھا کہ مرنے والے سے نفرت کی حد تک الجھن رہی تھی۔ مگر پھر بھی تدفین اور اس کے مراحل اس کی ذمہ داری تھے۔ اس نے اپنی ساری زندگی بے حسی کے چولے میں مقید ہو کر گزاری تھی، لیکن یہ بے حسی و بیزاری صرف اس کے ماں باپ کے لیے تھی۔ گھر سے باہر والوں کے لیے وہ ایک ویل مینرڈ، ہینڈسم اور ماڈرن شخص تھا اور اب جب اس کا باپ اس دنیا کو چھوڑ چکا تھا تو اسے دل ہی دل میں کہیں بے حسی کی برف پگھلتی لگ رہی تھی۔ اسے اپنے باپ کی بہت سی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ ان کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد اسے ان کی کمی محسوس ہونا شروع ہوئی تھی۔ لیکن افسوس ناک بات یہ تھی کہ اسے روپوں کی کمی سے باپ کی کمی محسوس ہوئی تھی۔

وہ اپنے کمرے میں سود و زیاں کے عمل میں مبتلا الماری میں نجانے کیا تلاش کر رہا تھا۔ جب دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ کمرے میں آتے ہوئے اکبر کو اشارہ کر کے آیا تھا۔ اکبر پانی کا جگ اور گلاس ہاتھ میں لیے مردوں والے حجرے میں پانی پلا رہا تھا۔

"اکبر! بابا کی ڈائری کدھر ہے۔ میں ان کا سارا حساب دیکھنا چاہتا ہوں۔" اکبر اس سے عمر میں دو تین سال چھوٹا تھا۔ وہ بہت چھوٹی عمر میں ان کے گھر آیا تھا۔ وہ ان کے باپ کے کسی کزن کا بیٹا تھا اور پڑھائی کا شوق نہ رکھنے کے باعث لاہور آیا ہوا تھا کہ یہاں کوئی ہنر وغیرہ سیکھے گا۔ اس کا باپ اکبر کو بھتیجا جب کہ وہ اسے ہمیشہ ملازم سمجھتا تھا۔ اس کی نظر میں ہمیشہ اکبر کے لیے حقارت ہوتی تھی لیکن آج حالات مختلف تھے۔

اکبر چند لمحوں بعد وہ رجسٹرز لے آیا تھا جس میں دکان کا

سب حساب کتاب درج ہوتا تھا۔

"اکبر! باہر اندازاً" کتنے لوگ ہوں گے؟" پہلی سطر پر نظر دوڑاتے ہوئے اس نے اکبر سے پوچھا تھا۔ اکبر اس کے ملائم لہجے پر حیران ہو رہا تھا۔

"دو تین سو تو ہوں گے جی' چاچا جی! ماشاء اللہ بہت نیک بندے تھے۔ اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ بہت بڑا دل تھا ان کا۔ کئی گھروں کا چولہا ان کی وجہ سے جلتا تھا۔ جب سے کاروبار ٹھپ ہوا تھا تب سے اس بات کا بہت غم کرتے تھے کہ ان خاندانوں کا کیا ہوگا۔ جن کا مہینہ انہوں نے مقرر کر رکھا تھا۔ حالات کتنے خراب تھے مگر جتنا بن پڑتا تھا ان سب کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرتے تھے۔ تب ہی باہر دیکھیں جمگھٹا لگا ہے۔ اپنے تو اپنے پرائے بھی ان کے لیے رو رہے ہیں۔"

اکبر خود سب بتاتے ہوئے رو پڑا تھا۔ اس نے رجسٹر سے نظر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ اسے ساری زندگی اپنے باپ سے شکایتیں ہی رہی تھیں۔ اسے لگتا تھا اس کے باپ اور سرکس کے جوکر میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جس طرح سرکس میں جوکر اپنی حرکتوں سے لوگوں کا جم غفیر اکٹھا کرکے روپے بٹورتا ہے اسی طرح اس کے باپ کے گرد بھی لوگوں کا ہجوم رہتا ہے۔ اور اس کا باپ ان کی جیبیں خالی کرواتا رہتا ہے۔ یہ عقدہ تو آج کھلا تھا کہ وہ جیبیں خالی کروانے والوں میں سے نہیں بلکہ بھرنے والوں میں سے تھا۔

"اکبر! اندازہ لگا کر بتاؤ کل کتنی رقم چاہیے ہوگی۔ سب انتظامات کرنے میں؟"

اس نے کبھی اکبر کو اتنی اہمیت نہیں دی تھی کہ وہ اس سے اس قسم کے سوالات پوچھتا' لیکن آج تو صورت حال بے حد مختلف تھی۔

"چاچی کہہ رہی تھیں کہ گاؤں لے جائیں گے۔ اس میں بیس ہزار لگ جائیں گے۔ پھر گاؤں جا کر دیکھیں گے کہ کتنے لوگوں کی روٹی کرنی ہے۔ وہاں جا کر تو تایا جی سب سنبھال لیں گے۔ ابھی تو بیس ہزار کے قریب چاہئیں۔ ہمارے پاس بس پانچ ہی ہزار ہوں گے۔"

اس نے سب جتا دیا تھا۔ وہ کب سے دکان کا حساب کتاب کر رہا تھا۔ اندر کی صورت حال سے وہ سب سے زیادہ واقف تھا۔

"اکبر! بیس ہزار کہاں سے آئیں گے؟" وہ بے حد پریشان ہو کر بولا۔ وہی اکبر جسے وہ کبھی مخاطب نہیں کرتا آج اس سے ہی وہ اپنائیت کا متقاضی تھا۔ اس کا دل تھا اکبر الہ دین کے چراغ کی طرح اس کے سب مسائل کو "حکم میرے آقا" کہہ کر حل کر دے۔

"پرسوں میری کمیٹی نکلی ہے' پانچ ہزار کی۔ دو تین ہزار جمع کیے ہوئے ہیں میرے پاس تو یہی ہیں۔ ان سے سب کچھ ہو سکتا ہے تو آپ کر لو۔"

اکبر نے واقعی بہت اپنائیت سے کہا تھا۔ اسے کچھ عرصہ پہلے والا واقعہ یاد آ گیا۔ اسے دوستوں کو پارٹی دینی تھی جس کے لیے تقریباً" سات آٹھ ہزار درکار تھے۔ اس کے باپ نے اسے اکبر کے پاس جا کر یہ رقم لے لینے کے لیے کہا تھا۔

"وہ دو ٹکے کا ملازم ہے۔ میں کبھی اس کے پاس نہیں جاؤں گا۔ یہ خیال آپ دل سے نکال دیں۔ آپ اسے فون کریں اور رقم منگوائیں اور پھر اپنے ہاتھوں سے مجھے دے دیں۔"

اس نے حقارت سے کہا تھا اور اب یہی اکبر اس کے لیے اپنی جمع پونجی لے آیا تھا۔

شرمندگی اور تاسف نے ایک ساتھ اس پر حملہ کر دیا۔ پردہ کتنا ہی بھاری کیوں نہ ہو' ایک دن اٹھ کر اسے بھید تو عیاں کرنا ہی ہوتا ہے اور کچھ چیزیں فقط بھید لگتی ہیں۔ مگر ہوتی نہیں ہیں۔ وہ سب باتیں جو آج اسے پتا چل رہی تھیں یہ سب تو اس کے ماں باپ وقتاً" فوقتاً" اسے بتاتے رہتے تھے اور وہ انہیں "بکواس" کہہ کر سر جھٹک دیتا۔

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر رہی تھیں۔ لیکن جیب ابھی بھی خالی تھی۔

"آپ پریشان نہ ہوں' میں باہر کے انتظامات دیکھتا ہوں۔ اس ڈائری کے آخر میں کچھ فون نمبر لکھے ہوئے ہیں۔ چاچا جی کے کاروباری دوستوں کے نمبر ہیں۔ اس میں آپ طاہر ملک کو فون کرلو۔ ایک وہی شخص ہے جو فوراً" پیسے دے سکتا ہے باقی تو ٹال مٹول کرنے لگیں گے۔ انسان دل کا سیٹھ ہو تو پھر اس کا بٹوہ موت بھی نہیں کھول سکتی۔ طاہر ملک کے علاوہ سب کے سب دل کے سیٹھ ہیں۔"

اکبر نے اسے ایک ڈائری تھمادی تھی۔ اس نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ باقی سب دل کے سیٹھ ہیں جب کہ طاہر ملک دماغ کا سیٹھ ہے۔ کیونکہ یہ بات اسے خود بھی نہیں پتا تھی۔

"مرتضیٰ! فیس جمع کروادی تھی؟" چائے کے بھاپ اڑاتے کپ کے کنارے پر انگلی پھیرتے ہوئے اس نے نسرین کے شگفتہ و تر و تازہ چہرے کی جانب دیکھ کر پوچھا تھا۔

"ایسی باتوں کے لیے پریشان مت ہوا کریں' آپ جو کام مجھے کہہ دیتے ہیں۔ وہ کبھی لیٹ نہیں ہوتا۔ تاخیر آپ کی عادت ہے۔ میں تو بجلی اور گیس کے بل بھی جس روز آتے ہیں' اس سے اگلے روز جمع کروا دیتی ہوں۔"

وہ اپنی ازلی مسکراہٹ کا سہارا لے کر بولی تھی۔ گزشتہ سات سالوں سے زندگی کی شاہراہ پر وہ چل کر نہیں بلکہ دوڑ دوڑ کر مرتضیٰ کا ساتھ دے رہی تھی۔ وہ پُراعتماد تھی لیکن مرتضیٰ کے ساتھ اور شہری زندگی نے اسے بے پناہ پالش کر دیا تھا۔ مرتضیٰ اپنی نصف بہتر کے لیے قدرت اور اباجی کا ایک ساتھ مشکور ہوتا تھا کہ جن کی بدولت اسے اتنی اچھی شریک حیات ملی تھی۔ اس کی شادی کو سات سال کا عرصہ ہو چلا تھا اور ان سات سالوں میں اس کی زندگی پہلے سے کہیں زیادہ آسودہ ہو چکی تھی۔ اباجی نے زمینوں کا بٹوارہ کر دیا تھا۔ اپنے حصے کی زمین اس نے مصطفیٰ بھائی کے ہاتھ بیچ دی تھی اور ملنے والی رقم سے اس نے گھر کی تعمیر مکمل کی تھی۔ تین کمرے اور کچن تو وہ شادی کے بعد بنوا چکا تھا لیکن باقی کا کام اس نے اسی رقم سے پورا کیا تھا۔ اوپر والا پورشن ابھی بھی نامکمل تھا لیکن فی الحال اسے اس حصے کی ضرورت نہیں تھی۔

شادی کے بعد ہی اس کے لیے پی ٹی وی لاہور مرکز گھر جیسا ہو گیا تھا۔ ایک تو ڈرامے بہت کثرت سے بننے لگے تھے پھر ہر ڈرامے میں باپ' بھائی' داماد یا دوست جیسے سپورٹنگ رولز بہت ہوتے تھے جن کی وجہ سے اس کی خوش بختی عروج پر تھی۔ وہ ان ساری باتوں کا کریڈٹ نسرین کو دیتا تھا۔ جس نے اس کی زندگی کے دھارے کو پُرسکون کر دیا تھا۔

اباجی اور اماں جی اسی کے ساتھ رہتے تھے لیکن گاؤں سے پرانا تعلق تھا' سو جلدی اداس ہو جاتے اور بڑے بیٹے کے پاس بھاگ جاتے' جہاں ان کے اپنے بہن بھائی بھی آباد تھے۔ خصوصاً" ان کے بھائی جن کی اباجی سے خوب بنتی تھی' اللہ نے شادی کے تین سال بعد اولاد کی نعمت سے نواز دیا تھا۔ ارتضیٰ جو کہ ان میں اس کی جان تھی' اس کا بیٹا تھا بھی بس قابل ہے۔ ابھی صرف چار سال کا تھا مگر بے حد ذہین اور شرارتی۔ یعنی زندگی کے بینک میں اس کا بینک بیلنس خاصا اچھا جا رہا تھا۔

"بھئی صاحب! آپ کا فون ہے۔" وہ نسرین کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ ارتضیٰ نے اپنے توتلے لہجے میں اطلاع دی۔ پی ٹی وی کے لوگوں میں وہ "بھئی صاحب" کے نام سے جانا جاتا تھا۔

"ادھر آؤ بھئی صاحب کے بچے لگتے۔ کتنا سمجھایا تھا آپ کو۔ بابا کو نام سے نہیں پکارتے۔ بری بات ہوتی ہے۔"

نسرین اسے جھڑکنے لگی تھی' مرتضیٰ مسکراتا ہوا فون کی جانب بڑھ گیا۔ ماں بیٹے کے معاملات میں وہ کم ہی دخل دیتا تھا۔

"فون والے انکل نے یہی کہا تھا۔ میں تو بابا کو بابا ہی کہتا ہوں۔"

وہ منہ بسورتے ہوئے ماں کی گود میں چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ فی الحال وہ نزدیکی انگلش میڈیم اسکول میں پڑھ رہا تھا لیکن مرتضیٰ کا ارادہ تھا کہ اسے ایچی سن میں داخل کروائے گا۔ GC میں اس نے بہت سی اسپیشل شخصیات کو اسی اسکول سے وابستہ ہونے کی وجہ سے انتظامیہ کی جانب سے اسپیشل پروٹوکول کا مستحق پایا تھا سو اس کا ارادہ تھا کہ اپنے بیٹے کو بھی ایچی سن ہی بھیجے گا۔ وہاں ایڈمیشن ہو رہے تھے اسی سلسلے میں کسی کا فون تھا۔

"کل نو بجے تیار رہئے۔ ٹیسٹ اور انٹرویو ہوگا۔" فون سن کر وہ نسرین کو تاکید کرنا نہیں بھولا تھا۔ اسے ارتضیٰ کی ذہانت پہ یقین تھا لیکن وہاں پہنچ کر مسئلہ اس کی اپنی ذہانت کا آ گیا تھا۔ ارتضیٰ سے پہلے اسے خود انٹرویو دینا پڑا تھا۔

"مرتضیٰ صاحب! یہ ہماری پالیسی کے خلاف ہے۔ یہاں ہائی جینٹری اپنے بچے بھیجتی ہے۔ کیونکہ سب جانتے ہیں ایچی سن کا معیار کیا ہے یہاں کیسے گھرانوں کے بچے پڑھتے ہیں' آج کل سب لوگ اپنے بچوں کے حوالے سے بہت کانشس ہو گئے ہیں۔ ایک نوٹنکی والے کے بیٹے کو ایڈمیشن دینے کا مطلب سمجھتے ہیں نا۔ آپ۔۔۔ یہاں ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔ لوگ بار بار آکر مطالبہ کریں گے' اس لیے ہماری جانب سے معذرت قبول فرمائیں۔" کلیریکل آفس میں بیٹھے ایک شخص نے بہت تحمل سے اسے ساری بات سمجھائی تھی۔ یہ ان کی مہربانی تھی کہ وہ اسے اتنا کچھ بتا رہے تھے جب کہ پرنسپل آفس سے تو اسے اتنا کہہ کر لوٹا دیا گیا تھا کہ آپ کا بچہ انٹرویو ہی کلیئر نہیں کر سکا' فائنل ٹیسٹ میں کیا کرے گا۔" اس نے بہت مشکل سے اپنا

غصہ ضبط کیا۔

"او تسٹ۔۔۔ یہی ایک اسکول نہیں ہے۔ میں اپنے بیٹے کو کسی اور اس سے زیادہ اچھے اسکول میں داخل کروا دوں گا۔"

وہ نخوت سے اتنا کہہ کر پلٹ آیا تھا۔ قرعۂ فال بیکن ہاؤس کے نام نکلا تھا۔ وہاں اس کے بہت سے کولیگز کے بچے بھی پڑھ رہے تھے۔ سو ارتضیٰ بھی وہیں جانے لگا۔ مگر اس بات نے مرتضیٰ کو بہت دن تک عجیب سے ملال میں گھیرے رکھا۔ اس کے ملال کو دیکھ کر اسی کے جیسے بیک گراؤنڈ والے کسی کولیگ نے اسے سمجھایا تھا۔

"یار! یہ تو بہت عام سی بات ہے۔ تم مجھ سے مشورہ کرتے تو میں تمہیں وہاں جانے ہی نہ دیتا۔ یہ ان کی پالیسی نہیں ہے۔ تعصب ہے۔ تم اکیلے تو تنگی والے نہیں ہو۔ یہ جو بڑے بڑے رائٹرز اور مو تنش کے بچے اس فیلڈ میں آگئے ہیں تو کیا یہ تو تنگی والے نہیں ہیں مگر ان کے بچے تو اسی اسکول میں پڑھ رہے ہیں اور ان لوگوں کو وہاں سے خارج کروانے کے لیے کوئی مطالبہ نہیں کرتا۔ یار جو چیز واقعی اہمیت رکھتی ہے وہ بیک گراؤنڈ ہے۔ تم دیہاتی ہو مگر کوئی پوچھے اچھی سن میں دیہاتیوں کی اولادیں نہیں پڑھتیں۔ وہ سب لوگ جو انگریزوں کے زمانوں میں مربعوں پہ مربعے پار رہے تھے وہ خود کو بہت فخر سے رورل (Rural) بیک گراؤنڈ کا ظاہر کرتے ہیں۔ ایچی سن میں کثیر تعداد میں رورل بیک گراؤنڈ کے حامل بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ کہنے کو ایک بیک گراؤنڈ بن گیا نا۔ رورل بیک گراؤنڈ۔ مگر تمہارا رورل بیک گراؤنڈ تھا ایک مرلہ پر مشتمل تھا۔ اور یہاں ہزاروں مربعوں والے لوگ کھاتے کھولے بیٹھے ہیں۔ ایسی صورت حال میں خوامخواہ اپنے بچوں کو بھیج کر احساس کمتری میں مبتلا کرنے کا فائدہ۔ ہمارے بچے وہ غلطیاں کیوں کریں جو ہم نے کی تھیں۔"

اسے اتنے مفصل اور اچھے انداز میں سمجھایا گیا اور وہ واقعی سمجھ بھی گیا۔

"یہ جوگرز بالکل بھی اچھے نہیں ہیں۔" ارتضیٰ نے ڈبہ دیکھتے ہی ناپسندیدگی سے ناک چڑھائی تھی۔ حالانکہ ابھی اس نے جوگرز دیکھے بھی نہیں تھے۔

"آپ پہن کر تو دیکھو بیٹا! یہ بہت اچھے ہیں۔" مرتضیٰ نے اسے پچکار کر کہا جب کہ اس کا منہ لٹک گیا تھا۔ وہ بہت دن سے نئے جوگرز کے لیے ضد کر رہا تھا۔ مرتضیٰ کا مارکیٹ کا چکر لگا تو وہ اس کے لیے جوگرز لے آیا۔ اچھے سروس کے بلیک اینڈ وائٹ جوگرز تھے لیکن ارتضیٰ آف ہو چکا تھا۔ وہ نو سال کا ہو چکا تھا اور اپنے والدین کے لیے ابھی بھی اکلوتا ہی تھا۔ اس کی طبیعت میں ضد کا عمل دخل تھا۔ مرتضیٰ کے لاڈ پیار نے اسے خود سر بنا دیا تھا۔ ظاہری شخصیت میں وہ باپ کے بالکل برعکس تھا۔ اتنی سی عمر میں بھی وہ انتہا سے زیادہ برانڈ کانشس تھا۔ اسے چھوٹی موٹی چیزیں پسند نہیں آتی تھیں۔ سروس شوز کا ڈبہ دیکھ کر اس کا منہ بن گیا تھا۔

"مجھے adidas کے جاگرز چاہیے تھے۔ یہ چار سو روپے کے جاگرز میں نہیں پہنوں گا۔ آپ کو پتا بھی ہے کہ میرے پاؤں اور ڈنری برانڈز کے فٹ ویئرز میں خراب ہو جاتے ہیں۔"

مرتضیٰ نے حیرانی سے اس کی جانب دیکھا۔

"اب میں انہیں واپس نہیں کر سکتا۔ میں انہیں خرید چکا ہوں' اس لیے اب تم انہیں رکھ لو۔ چند دن بعد جب یہ جاگرز پرانے ہو جائیں گے تو میں تمہیں adidas کے جاگرز دلوا دوں گا۔" وہ اسے پچکار رہا تھا۔

"نہیں۔۔۔ میں انہیں نہیں رکھ سکتا۔ میں کہہ چکا ہوں مجھے یہ جاگرز نہیں چاہئیں۔" وہ قطعیت سے کہہ کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ مرتضیٰ نے پاس کھڑی نسرین کی جانب دیکھا۔ اسے بیٹے کی فرمائش پوری نہ کرنے کا دکھ تھا۔ نسرین اس کے قریب چلی آئی پھر اس کے قریب سے گزر کر پیچھے کھڑی ہوئی اور اس کے کندھوں کو دھیرے دھیرے سہلانے لگی۔

"آپ اس کی فکر نہ کریں بچہ ہے۔ ابھی جب کھیلنے کے لیے باہر جائے گا تو دیکھیے گا یہی جاگرز پہن کر چلا جائے گا۔ آپ شاور لے لیں میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں۔" وہ بہت محبت سے اپنے نرم ہاتھ اس کے کندھوں پر پھیر رہی تھی جیسے اس کی تھکن دور کرنے کے ساتھ ساتھ ارتضیٰ کی باتوں کا اثر زائل کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

"وہ ناراض ہو گیا ہے۔ ایک ہی تو بیٹا ہے میرا۔ میں اسے اس کی پسند کے جاگرز نہیں دلوا سکتا کیا۔ تم بلاؤ اسے۔۔۔ میں اسے ابھی مارکیٹ لے چلتا ہوں۔"

پوری رات اور ساری دوپہر شوٹنگ کروا کر لوٹنے کے بعد بھی وہ بیٹے کا بجھا چہرہ روشن کرنے کی تدبیر کر رہا تھا۔

"آپ پہلے ہی میری بات مان لیا کریں۔۔۔ آپ جانتے ہیں' میں غلط بات نہیں کرتا۔" adidas کے جاگرز خرید کر وہ بے تاثر لہجے میں بولا تھا جب کہ اس کا یہ نوابی انداز مرتضیٰ کو مسکرانے پر مجبور کر گیا۔ اسے بیٹے کی فرمائش پوری کرنا اچھا لگتا تھا۔

وقت کچھ اور آگے سرک آیا تھا اور زندگی کا چہرہ مزید کھل کر سامنے آچکا تھا۔ وہ ایک آسودہ زندگی گزار رہا تھا۔ اسے زندگی کی بازی میں اپنے کارڈز ذہانت سے استعمال کرنے آگئے تھے تب ہی کسی تنگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا تو پھر وہ بیٹے کو خواہشات کے معاملے میں تشنہ کیوں رکھتا۔

انہی دنوں سیاسی اتار چڑھاؤ تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے۔ اچانک منتخب حکومت ختم ہو گئی۔ گزشتہ حکومت کے وفاداروں کو دھڑا دھڑ نوکریوں سے برخاست کیا جانے لگا۔ مرتضیٰ ہوٹل کی نوکری چھوڑ کر صرف پی ٹی وی کا ہو کر رہ گیا تھا اور یہاں بھی اس کی وفاداری نیوٹرل تھی لیکن وہ حسنین بخاری کے ساتھ جا کر اٹھتا بیٹھتا تھا' جو برخاست حکومت کے حامی تھے سو اس کے لیے بھی پی ٹی وی کے دروازے بند ہو گئے اور اس قدر زور دار آواز کے ساتھ بند ہوئے کہ وہ دہل کر رہ گیا۔ انسان جتنا مرضی قابل ہو' لیکن جب کسی ایک کام کے ساتھ بندھ کر رہ جاتا ہے تو پھر وہ اسی کام کا ہو جاتا ہے۔ مرتضیٰ کو تو یاد بھی نہیں تھا کہ وہ اداکاری کے علاوہ کچھ کر سکتا ہے۔ اس کی روزی روٹی اداکاری ہی تھی سو اسے ایک بار پھر تھیٹر کا رخ کرنا پڑا لیکن اب کی بار وہ کمرشل تھیٹر کی جانب آگیا تھا۔ یہ پروفیشنل قسم کا تھیٹر تھا اور اس میں معاوضہ بہرحال مل جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی دودکانیں تھیں جہاں سے کرایہ آجاتا تھا۔ مصطفیٰ بھائی کی جانب سے گندم' چاول اور سبزیاں وغیرہ ملتی رہتی تھیں۔ سو معاشی مسائل کا اسے سامنا نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

"تھیٹر کیا چیز ہے؟"

اس لفظ کی کوئی حتمی وضاحت نہیں دی جا سکتی۔ یہ کس سن میں وجود میں آیا اس بارے میں بھی وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن ایک بات یقینی ہے کہ تھیٹر ڈرامہ سے نہیں پہلے وجود میں آیا تھا۔ جب یہ دونوں اکٹھے ہوئے تو ڈرامہ تھیٹریا تھیٹریکل ڈرامہ کہلائے۔

کہتے ہیں اس کی ابتدا یونانیوں نے کی تھی۔ یونانیوں نے جب اپنا تہذیبی ورثہ یورپ کو منتقل کیا تو تھیٹر بھی کشاں کشاں یورپ چلا آیا اور جب انگریز بہادر نے برصغیر میں قدم رکھا تو ہندوستانی پہلی مرتبہ اس آرٹ سے متعارف ہوئے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ جب مسلمان برصغیر میں آئے تو تھیٹر سے ملتی جلتی کچھ چیزیں پہلے ہی یہاں موجود تھیں۔

بٹوارے کے وقت جو چیزیں ہمارے خطے کو خود بخود مل گئیں تھیٹریا تھیٹریکل روایات ان ہی چیزوں میں شامل ہیں۔ یہاں بھی تھیٹر کا مقصد عوامی تفریح کے نئے ذرائع پیدا کرنا تھا۔ ابتدائی تھیٹر واقعی ان روایات کو پورا کرنے اور اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب رہا۔ ہمارے خطے کے بہت اچھے اداکار و لکھاری اس تھیٹر کے ساتھ وابستہ رہے اور بطریق احسن اپنی ذمہ داریاں پوری کرتے رہے۔

ٹی وی کے آجانے سے بھی تھیٹر انڈسٹری پہ زوال نہیں آیا تھا۔ وسیع ذہنی کینوس کے حامل لوگ بہت شوق سے اس تفریحی ذرائع کا استعمال کرتے رہے پھر یکا یک نجانے کیسے ہمارے خطے میں تھیٹر انڈسٹری کا زوال شروع ہوا۔ تھیٹر دو حصوں میں بٹ گیا۔ ایک کمرشل تھیٹر اور ایک نان کمرشل تھیٹر۔

غلام مرتضیٰ بھٹی نے جب کمرشل تھیٹر جوائن کیا تو حالات دگرگوں نہیں تھی لیکن قریب قریب کالی ذہنی پسماندگی اور گھٹیا پن اس مثبت تفریحی ذرائع میں شامل ہونے لگا تھا۔

ان دنوں ٹی وی پر عوام میں ایڈز کے متعلق آگہی پیدا کرنے کے لیے ایک ڈیڑھ منٹ کا ایڈ چل تو رہا تھا لیکن اس میں بات بہت ڈھک چھپ کر بیان کی جاتی تھی۔ جب کہ اسے جو اسکرپٹ دیا گیا تھا اس میں پھکڑپن کی انتہا ہو گئی تھی۔ جا بجا ایسے جملے تھے جو کسی بھی طرح سے شائستگی کے زمرے میں نہیں آتے تھے۔ وہ گرین روم سے کاغذ ہاتھ میں پکڑے اسٹیج کی جانب آگیا۔ عرفان رحیم لائٹنگ کے ارینجمنٹ کو چیک کر رہا تھا۔ وہ سیدھا اسی کے پاس چلا گیا۔

"یہ کیا بے ہودہ بکواس تھمادی تم نے ہمیں۔" وہ اسکرپٹ والے پیپرز اس کے چہرے کے سامنے لہرا کر بولا۔ عرفان رحیم نے حیرانی سے اس کے عمل کو دیکھا۔

"بھٹی صاحب!! اسکرپٹ تب ہی ایکٹرز تک پہنچتا ہے

جب اپروو ہو جاتا ہے۔ مجھے پروڈیوسر نے یہی اسکرپٹ دیا ہے اور میں نے بھی ایکٹرز کو یہی دینا تھا۔" وہ صاف گوئی سے بولا۔

"یہ اسکرپٹ نہیں ہے۔ یہ تو نری واہیاتی ہے۔ اس میں کئی جملے ایسے ہیں جو میں اپنی بیوی کے سامنے با آواز بلند نہیں ادا کر سکتا تو کسی اور خاتون کے سامنے کیسے ادا کروں گا۔ وہاں ہال میں کئی خواتین ہوں گی جو اپنے عزیز و اقارب کے ہمراہ آئیں گی۔ ایسی صورت حال میں یہ چیپ ڈائیلاگز انہیں ہی نہیں ہمیں بھی ہماری نظر میں شرمندہ کروادیں گے۔"

مرتضیٰ کا انداز قطعیت بھرا تھا۔

"آپ پروڈیوسر صاحب سے مل لیں تو بہتر ہوگا۔" عرفان رحیم نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا تھا۔

"بھئی صاحب! کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ... مزید آٹھ نو سال گزریں گے تو ہم اکیسویں صدی میں داخل ہو جائیں گے۔ اس اکیسویں صدی کے تقاضے ہوں گے یہ سب۔ آپ کا کیا خیال ہے یہ سب باتیں جو اسکرپٹ میں لکھی ہیں غیر ضروری ہیں' نہیں معاشرے کا اتنا بڑا ناسور ہے یہ بیماری... اس کے متعلق لوگوں کو بتانا ہی ہوگا۔" طاہر ملک نے اس کی بات کو سن کر بہت تحمل سے کہا اور پھر اپنے باہر کو اٹھتے ہوئے پیٹ کو سہلانے لگا تھا۔

"احترام اور حیا بھی کوئی چیز ہوتی ہے ملک صاحب... جس چیز کا آپ ذکر کر رہے ہیں' وہ تو ایک بے حد سنجیدہ سی بات ہے جب کہ آپ نے اس بات کو انتہائی گندے طریقے سے ایکسپوز کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں اور سب کچھ تو نظر آرہا ہے۔ مگر آگہی کہیں نظر نہیں آرہی۔"

وہ ملک صاحب کے ساتھ پہلے بھی کام کر چکا تھا اس لیے ذرا رعب سے بات کر رہا تھا۔ اس کی بات پر طاہر ملک اس کی جانب دیکھتا رہا پھر ہونٹ بھینچ کر بولا۔

"اوکے... آپ کو جن ڈائیلاگز پر اعتراض ہے' آپ انہیں اسکرپٹ سے نکال دیں۔" مرتضیٰ اطمینان کا سانس لے کر دوبارہ گرین روم میں چلا آیا۔ اسکرپٹ اسے آج ہی ملا تھا ورنہ شاید وہ پہلے ہی بہت اطمینان سے اس کا کوئی حل ڈھونڈ لیتا۔ اس نے وہ تمام جملے چن چن کر انڈر لائن کیے جن پر اسے اعتراض تھا اور پھر ان کے ڈائیلاگز یاد کرنے لگا۔

یہ ڈرامہ اس کی زندگی کا پہلا برا ڈرامہ ثابت ہوا تھا۔ اپنے ڈائیلاگز کی چھانٹی کر کے وہ مطمئن ہو گیا تھا کہ اس نے تمام اسکرپٹ میں موجود غلاظت کو ختم کر دیا۔ وہ یہ بھول گیا تھا اس کے علاوہ بھی اس ڈرامہ میں پانچ تین کریکٹرز تھے جب کہ چند دوسرے چھوٹے موٹے کریکٹرز کی انٹریز بھی تھیں۔ ان سب باقی کریکٹرز نے چیپ ڈائیلاگز ہی بولے تھے اور خوب جم کر بولے تھے۔ وہ ڈرامہ مرتضیٰ کی زندگی کا برا ڈرامہ تھا مگر باقی لوگوں کے لیے اس ڈرامے کا پہلا شو ہی کھڑکی توڑ ثابت ہوا۔

"ہم نے ایک نئی جہت متعارف کروائی ہے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ ہم کامیاب نہ ہوتے۔" طاہر ملک نے پہلے شو کے آخر میں رعونت بھرے لہجے میں بطور خاص اس کی جانب دیکھ کر کہا تھا۔ مرتضیٰ اس روز تینوں شوز کرتے ہوئے شرمندہ ہی ہوتا رہا جب کہ حیرانی اسے اس بات پر بھی تھی کہ ہال میں بیٹھی خواتین ایسی باتوں پر قہقہے کیسے لگا سکتی ہیں۔ ہال میں جتنے بھی مرد و عورت تھے وہ سب کے سب اس ڈرامہ کو خوب انجوائے کر رہے تھے۔ یہ ڈرامہ کافی دن تک ریکارڈ رش لیتا رہا اور مرتضیٰ پہلے کی طرح ایک ساتھ شرمندہ اور حیران ہوتا رہا۔ اس کے بعد جیسے یہ ٹرینڈ سا آگیا۔ لاہور کے تمام رائٹرز اور پروڈیوسرز جو تھیٹر کے لیے کام کرتے تھے' مل جل کر کچھ ایسے ڈرامے تیار کرنے لگے جو اطمینان سے فیملی کے ساتھ بیٹھ کر دیکھنے والے نہیں تھے۔

"آپ کی سوچ کچھ زیادہ ہی بیک ورڈ ہو گئی ہے۔" اس کے اعتراض پر یہی جملہ سننے کو ملتا' اس روز فرزند بیگ نے اسے ایک نئی ڈوز دینے کی کوشش کی۔

"بھئی صاحب! دنیا میں اتنے مسائل ہیں۔ عوام کے ذہن ان مسائل سے جکڑے ہوتے ہیں۔ وہ یہاں ایسی تفریح کے حصول لیے آتے ہیں جو انہیں تازہ دم کر دے' انہیں تفریح پہنچانے کے لیے اگر چند ایک جملے ایسے استعمال کر لیے جائیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ عوام ہنستے ہیں اور پھر بھول جاتے ہیں۔ انہیں ہنسنے سے غرض ہوتی ہے۔ وہ اس بات کی پروا نہیں کرتے کہ انہیں کس قسم کے مواد سے ہنسایا جا رہا ہے۔"

"اگر تمہاری ماں سامنے ہال میں بیٹھی ہو تو کیا تب بھی تم یہی ڈائیلاگز بولنے پر اصرار کرو گے۔"

مگر اس نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ طاہر ملک نے اسے

اپنے دوسرے ڈرامہ کے لیے بلوایا ہی نہیں تھا۔ کیونکہ وہ بحث کو کچھ خاص پسند نہیں کرتا تھا۔ اس نے یہی بہتر سمجھا تھا کہ غلام مرتضیٰ بھٹی کے بجائے کسی دوسرے اداکار کو بلالیا جائے۔ مرتضیٰ کا دل متفکر ضرور ہوا تھا مگر اتنا نہیں کہ وہ تھیٹر چھوڑ دیتا۔ اس روز ایک عجیب بات ہوئی۔

اس کا ایک دیرینہ دوست سعدی لندن سے آیا ہوا تھا۔ مرتضیٰ کے ڈراموں کی وڈیو کیسٹ تیار تھیں جو اس نے خود بھی ابھی نہیں دیکھی تھیں۔ مرتضیٰ نے وہ سعدی کو دے دیں۔ تین چار روز بعد سعدی اس سے دوبارہ ملنے کے لیے آیا۔

"انہیں تمہارے ساتھ بیٹھ کر دیکھتے ہیں۔ مل کر دیکھنے میں زیادہ مزہ آئے گا۔" سعدی نے سنجیدہ لہجے میں کہا تھا۔ مرتضیٰ بھی فارغ تھا۔ سو اس نے ہنسی خوشی وڈیو لگوا دیا۔

ڈرامہ کے ڈائیلاگز اتنے چیپ نہیں تھے مگر ابھی پچیس منٹ کا ڈرامہ گزرا تھا کہ ایک فربہی مائل جسم کی میک اپ میں لتھڑی ہوئی رقاصہ اسٹیج پر آکر رقص کرنے لگی۔ اس کے اسٹیپس سے زیادہ ہال میں بیٹھے لوگوں کی سیٹیاں تھیں جو مرتضیٰ کو پریشان کر رہی تھیں۔

"یہ بتا نہیں کیسے یہ بعد کی ریکارڈنگ ہے۔" اس نے شرمندگی کے احساس میں گھر کر سعدی سے کہا تھا۔

"تم دیکھتے جاؤ۔" سعدی اسکرین کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اڑھائی گھنٹہ کے اس ڈرامہ میں تین رقص شامل تھے اور مرتضیٰ تینوں سے ہی لاعلم تھا' جب کہ سعدی اس کی کوئی بات سننے پر تیار نہیں ہوا۔

"تمہیں شرم آنی چاہیے یہ سب کرتے ہوئے۔ تم اسے فن کی خدمت کہتے ہو۔ ایسے کرتے ہیں فن کی خدمت۔ تو یہ سیدھا سیدھا فحاشی کا اڈا ہے جو تم چلا رہے ہو۔ اتنی غربت آگئی ہے تم پر۔ بھوکے مر رہے ہو تم یا پھر ایسی کون سی مجبوری ہے جو تمہیں یہ سب کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ مجھے تم سے گھن آرہی ہے مرتضیٰ۔" وہ اس کی بات سنے بغیر اپنی کہے گیا تھا اور پھر حقارت سے اسے خدا حافظ کہے بغیر چلا گیا تھا۔

"مجبوری۔۔۔؟" مرتضیٰ نے ایک لفظ دہرایا تھا۔ واقعی اسے کوئی مجبوری تو نہیں تھی۔

"مجھے فائیو تھاؤزنڈ دے دیں۔" ارتضیٰ نے عجلت بھرے انداز میں لاؤنج میں داخل ہو کر اسے مخاطب کیے بنا اپنا مدعا بیان کیا تھا۔ مرتضیٰ آنکھوں پہ چشمہ لگائے اخبار ہاتھ میں لیے شوبز کے پیج پر نظریں دوڑا رہا تھا' کبھی کسی ایسے اداکار یا اداکارہ کی تصویر یا ان کے متعلق کوئی خبر آجاتی' جن کے ساتھ وہ کام کر چکا تھا۔ تو وہ اس خبر کو بہت شوق سے پڑھتا تھا۔ اب بھی وہ خالد عباس ڈار کے بیان اور تصویر کو بہت مسکراتی نظروں سے دیکھ رہا تھا جب ارتضیٰ نے آکر مطالبہ کیا۔

"اس تصویر کو دیکھو ارتضیٰ۔ یہ بہت اچھے ایکٹر ہیں۔ میں نے ان کے ساتھ دو تین بار کام کیا تھا۔ بہت بڑی سنجیدہ شخصیت کے مالک ہیں۔ مجھے، سنت۔۔۔"

"مجھے فائیو تھاؤزنڈ چاہیے تھے۔" ارتضیٰ کی جھنجلاہٹ بھری آواز سنائی دی۔ اس نے سر اٹھا کر اپنے اونچے لمبے بیٹے کو دیکھا۔ اور پھر اس خیال سے نظر ہٹالی کہ کہیں اس کی نظر بیٹے کو نہ لگ جائے۔ سفید ٹریک سوٹ میں ملبوس سترہ سالہ ارتضیٰ بھٹی شاندار قد کاٹھ کا مالک اور نہایت اچھے نقوش کا حامل نوجوان تھا۔ اعتماد اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ صحت مند اٹھان تھی۔ جسے ایکسرسائز و سوئمنگ اور ٹینس نے چار چاند لگائے تھے۔ اس پر مستزاد جب وہ خوبصورت لہجے میں فر فر انگریزی بولتا تو مرتضیٰ کا دل نہال ہو جاتا۔

"میرا بیٹا شہزادوں سے بڑھ کر ہے۔" وہ اکثر نسرین سے کہتا تھا حالانکہ اس تحریر پیش کش کی وہ برابر کی ذمہ دار تھی مگر پھر بھی وہ چڑ جاتی۔ اسے اپنے شہزادے کے نخروں سے ڈر لگنے لگا تھا۔

"کہاں کھو گئے ہیں' مجھے دیر ہو رہی ہے۔" وہ جھنجلا کر بولا۔

"میرے پاس اس وقت فائیو تھاؤزنڈ نہیں ہیں۔ تم ون تھاؤزنڈ لے لو۔ میں تمہیں کل۔۔۔" وہ جیب سے بوسیدہ والٹ نکال رہا تھا مگر ارتضیٰ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"نو تھینکس مجھے فائیو ہی چاہئیں۔" اس نے اتنا کہا اور پلٹ کر تیز تیز چلتا ہوا کچن کی جانب چل دیا۔ اس کے انداز میں ناراضی نمایاں تھی۔ مرتضیٰ کا دل بے ورد کھا۔ اس کے معاشی حالات دن بہ دن تنزلی کی جانب گامزن تھے۔ گزشتہ چھ سالوں میں وہ چھ ہی کاروبار تبدیل کر چکا تھا۔ اپنی پینورما میں موجود دو دکانوں میں سے ایک میں آج کل وہ ریڈی میڈ گارمنٹس کا کاروبار کر رہا تھا۔ اس سے پہلے مردانہ فٹ ویئرز رکھے تھے اور اس سے بھی پہلے اس نے کمپیوٹر کے کاروبار کو چلانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن

کیا بات تھی وہ کاروباری اسرار و رموز سیکھ ہی نہیں پایا۔ جو جمع جتھا تھا وہ دل کی صورت دکان میں منتقل تھا مگر برکت نہیں پڑتی تھی' اسی لیے آج کل وہ ہاتھ پاؤں گزارہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اور اس نے اس سال ایک نیا جوڑا نہیں بنایا تھا۔ لیکن یہ موقع تھا کہ اس نے بیٹے کو انکار کر دیا تھا' ارتضیٰ کچن چلا گیا تو وہ بھی اٹھ کر اسے منانے کے لیے پیچھے گیا مگر ابھی وہ کچن اور لاؤنج کے درمیانی راستے میں تھا اس کے کانوں میں ارتضیٰ کی پھنکارتی آواز سنائی دی۔

"انسان کس لیے کماتا ہے۔ بچوں کے لیے نا۔۔۔ تو پھر مجھے پہلی بار مانگنے پر پیسے کیوں نہیں دے دیتے۔ مجھے اچھا لگتا ہے کہ میں فقیروں کی طرح ان کے آگے گڑگڑاؤں۔ تب ہی میرے سامنے پیسوں کی کمی کا رونا رونے لگتے ہیں۔"

"ان کے بارے میں اس لہجے میں بات مت کرو ارتضیٰ۔ ان کے پاس واقعی پیسے نہیں ہوں گے ورنہ وہ کبھی انکار نہیں کرتے۔" نسرین کی دھیمی سی آواز سنائی دی۔

"ان کے پاس کبھی پیسے ہوتے بھی ہیں ممی لیں ممی۔ بس مجھے پیسے دیتے ان کی جان جاتی ہے۔ وہ اپنی دولت پر سانپ بن کر بیٹھے ہیں۔ اتنے روپے کہاں لے جائیں گے وہ مجھ سے زیادہ تو نہیں مانگ لیے۔ اونلی فائیو تھاؤزنڈ۔ فائیو تھاؤزنڈ کی اوقات ہی کیا ہے آج کل کے زمانے میں۔ شوق ہے مجھے چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے ترسانے کا۔ وہ کبھی مجھے خوشی سے پیسے نہیں دیتے۔ وہ چاہتے ہیں میں ان کی منتیں کرتا رہوں۔ آپ جانتے بوجھتے ہوئے ان کا ساتھ دیتی ہیں۔"

ارتضیٰ نے آواز کا والیوم کم کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"تم اپنے خرچ کم کرنے کی کوشش کرو بیٹا۔۔۔ اب پہلے جیسے حالات نہیں رہے۔" نسرین نے ایک بار پھر اسے سمجھانا چاہا تھا۔

"میں اپنے خرچے کم کروں؟" وہ بھڑک اٹھا۔ "یعنی میں اپنے خرچے کم کروں۔ میرے خرچے ہیں ہی کیا۔ کیا کیا کرتا ہوں میں؟ آپ نے میرے کلاس فیلوز کو نہیں دیکھا۔ ان کے خرچے دیکھ لیں تو شاید حیرانی سے مر جائیں۔"

"خدا نہ کرے۔" باہر لابی میں کھڑا مرتضیٰ دہل کر رہ گیا تھا۔ اس کی آواز اتنی اونچی نہیں تھی کہ کچن میں موجود ماں بیٹا سن پاتے۔

"آپ لوگ مجھے اس طرح ٹریٹ مت کریں جیسے کسی بھکاری کو کرتے ہیں۔ دل چاہا تو دو روپے کا سکہ دے دیا' نہیں دل چاہا تو "معاف کرو بابا۔" کہہ کر ٹال دیا۔ آپ لوگوں سے میرے خرچے پورے نہیں ہو سکتے تھے تو آپ کو مجھے پیدا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں اپنی مرضی سے تو اس دنیا میں نہیں آیا۔"

وہ پھنکار رہا تھا۔ مرتضیٰ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کھڑا یہ سب سن رہا تھا' اس نے اپنے بیٹے کو یہ سب نہیں سکھایا تھا۔ وہ تھکے قدموں سے چلتا اپنے بیڈ روم میں آگیا پھر وارڈ روب کھول کر کپڑوں کی تہ کے نیچے رکھا ایک والٹ نکال کر اس نے اس میں سے گن کر پانچ ہزار ہزار کے نوٹ نکالے تھے۔ یہ روپے اس نے نسرین کے چیک اپ کے لیے آج ہی کسی سے ادھار لیے تھے۔ وہ بہت دن سے پیٹ میں عجیب سے درد کی شکایت کر رہی تھی۔ ان کے جنرل فزیشن نے تفصیلی چیک اپ کے لیے کہا تھا۔ وہ پانچ ہزار لیے دوبارہ کچن میں آگیا۔

"پلیز ارتضیٰ! آہستہ بولو۔۔۔ تمہارے بابا سنیں گے تو انہیں کتنا برا لگے گا۔"

کچن کے دروازے سے بالکل اندر داخل ہوتے ہوئے اس نے نسرین کی آواز سنی۔

"شکر ہے ارتضیٰ! ابھی تم یہیں ہو۔ یہ لو یار پانچ ہزار روپے۔ مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ میرے پاس یہ روپے ہیں۔ ابھی دیکھا تو نظر آئے تم یہ رکھ لو۔ کیا پک رہا ہے نسرین! بہت بھوک لگی ہے۔ پیٹ میں ہلچل سی مچی ہے۔ اتنی بھوک لگ رہی ہے کہ بھوک کی وجہ سے سانس بھی پھول رہی ہے۔ لاؤ یار کوئی کیک رسک یا بسکٹ ہی دے دو۔ چائے بناؤ۔۔۔ کچھ دے دو مجھے کچھ دے دو نسرین۔" بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ کچن میں موجود چھوٹی ڈائننگ ٹیبل کے گرد بیٹھ گیا۔ ارتضیٰ روپے اس سے لے کر باک چڑھاتا کب کا کچن سے جا چکا تھا۔ نسرین نے گہری سانس بھری' دو موٹے موٹے آنسو اس کی پلکوں پہ لرزتے لرزتے رخسار پر ڈھلک آئے تھے۔ وہ خاموشی سے چائے کے لیے برتن تن کرنے لگی۔ جب کہ مرتضیٰ کے سامنے پڑی ٹیبل کی چکنی سطح گیلی سی ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"اب کیا ہوگا؟" رات کا نجانے کون سا پہر تھا جب چھت کی جانب کھلی آنکھوں سے دیکھتے نسرین نے بجھے بجھے لہجے میں سوال کیا تھا۔ وہ دونوں ہی چت لیٹے کب سے چھت کو تک رہے تھے۔ نسرین کے لہجے میں اس قدر مایوسی تھی کہ مرتضیٰ بے چینی سے تڑپ اٹھا۔ اس نے رخ بدل کر اس کی جانب دیکھا پھر ایک عجیب سے احساس میں گھر کر اسے اپنے قریب کرکے اپنے بازو اس کے گرد حمائل کردیے۔ نسرین کی سسکیاں رات کی تاریکی میں کمرے کے چاروں جانب ایک نیا اضطراب گھول رہی تھیں۔

"مجھے معاف کردیں مرتضیٰ! میں آپ کے لیے ہمیشہ سے ہی مسائل کا منبع رہی ہوں۔ میں آپ کی زندگی میں کوئی آسانی نہیں پیدا کرسکی۔ مجھے معاف کردیں۔"
سسکیوں کے درمیان وہ نجانے کس بات کی معافی تلافی کررہی تھی۔ اس کے گرد مرتضیٰ کی گرفت مضبوط ہوئی تھی۔

"تم کیوں پریشان ہوتی ہو۔ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ میں ہوں نا۔"
وہ اس کے بالوں بھرے سر پہ اپنا چہرہ رکھ کر بولا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی پانی تھا مگر وہ اپنی شریک حیات کو بے حوصلہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے تو اسے ڈاکٹر سے ہونے والی میٹنگ کی مکمل تفصیل بھی نہیں بتائی تھی۔ وہ جس پیٹ درد کو معمولی سمجھ کر نظر انداز کررہے تھے۔ وہ ہیپاٹائٹس سی نکلا تھا۔ نسرین تو ابھی بھی چیک اپ کے لیے راضی نہیں تھی۔ مگر اس کا تیزی سے زرد پڑتا چہرہ اور مضمحل وجود مرتضیٰ کو احساس دلا رہا تھا کہ تاخیر مناسب نہیں۔ نسرین کے چیک اپ کے لیے اسے ادھار لینا پڑا تھا۔ چیک اپ تو ہزاروں روپوں سے ہوگیا تھا لیکن اب ایک لمبا اور مہنگا علاج درکار تھا تاکہ اس بیماری کا قلع قمع کیا جاسکے۔ نسرین کو اس نے یہی بتایا تھا کہ یرقان کا عارضہ ہے۔ رپورٹس جان بوجھ کر اس نے اس کے ہاتھ نہیں لگنے دی تھیں۔ مبادا وہ جان جائے کہ ہیپاٹائٹس سی ہے اور وہ خطرناک اسٹیج پر پہنچ چکا ہے۔
وہ کافی دیر تک نسرین کے بالوں کو سہلاتا رہا تاکہ وہ سوجائے اور وہ سو بھی گئی تھی لیکن نیند مرتضیٰ کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ مسائل عفریت کی طرح اسے چاروں جانب سے دبوچ رہے تھے اور کوئی راہ فرار نہیں تھی۔ کاروبار مسلسل گھاٹے میں جارہا تھا۔ ارتضیٰ کے خرچے بڑھتے جارہے تھے۔ وہ اپنی لائف اسٹائل اسٹینڈرڈ کو برقرار رکھنے کے لیے کسی کی کوئی بات سننے کو نہیں ہوتا تھا۔ آج بھی سارا دن پرائیویٹ میڈیکل کلینکس پر خوار ہونے کے بعد جب وہ گھر پہنچے تھے ارتضیٰ کہیں باہر جانے کی تیاری کررہا تھا۔
"تمہاری ممّا کی رپورٹس پازیٹو نہیں ہیں۔" اسے مرتضیٰ نے اتنا ہی کہا تھا کہ وہ اپنا کٹ بیگ اٹھا کر بولا۔
"میں آپ کی باتیں واپس آکر سنوں گا۔ ابھی میرے فرینڈز انتظار کررہے ہیں۔ ہمیں مری کے لیے نکلنا ہے۔ آج رات میرا اسکواش کا میچ ہے۔" وہ ماں سے ملے بغیر باپ کو تسلی دیے بغیر باہر نکل گیا تھا۔ جب کہ مرتضیٰ تاسف سے دروازے کی جانب دیکھا۔
"کیا اولاد بھی پانی کے بلبلے کی طرح ہوتی ہے؟ کیا واقعی اس کو نہیں پکڑا جاسکتا۔" کمرے میں پھیلی اپنے بیٹے کی خوشبو محسوس کرتے ہوئے وہ یہی سوچ رہا تھا۔ حالات بھی اس کے قابو میں نہیں آرہے تھے۔ اس کی شاپ پر ایک ملازم تھا اکبر جسے وہ گاؤں سے گزشتہ سال لایا تھا ابا جی کے ماموں کے بیٹے کا بیٹا تھا۔ اچھا سمجھ دار اور قابل بھروسا لڑکا تھا لیکن ملازم بہرحال ملازم ہوتا ہے سو مرتضیٰ کا دل چاہتا تھا کہ ارتضیٰ ایک آدھ چھوٹی موٹی ذمہ داری تو سنبھال لے۔ وہ بہت اچھی ڈرائیونگ کرتا تھا۔ وہ ماں کو ڈاکٹر کے پاس لے جاسکتا تھا۔ یا مرتضیٰ کی غیر موجودگی میں شاپ کا ایک چکر لگا سکتا تھا۔ لیکن اسے ان سب کاموں سے نفرت تھی۔ سب سے بڑھ کر نسرین کے علاج کے لیے کافی رقم درکار تھی۔ وہ اپنے خرچے ہی کم کرسکتا تھا مگر وہ اس کے لیے بھی تیار نہیں تھا جب کہ مرتضیٰ کے کانوں میں مسلسل ڈاکٹر زمان کا جملہ گونج رہا تھا۔
"بہتر ہے شوکت خانم سے بھی ٹیسٹ کروالیے جائیں۔ تسلی ہوجاتی ہے۔ ہیپاٹائٹس سی ڈائریکٹ لیور کو بھی تو اٹیک کرتا ہے نا۔"
اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بیٹے کو پاس بٹھا کر یہ سب بتائے۔ نسرین سے تو یہ سب شیئر نہیں کیا جاسکتا تھا۔ گزشتہ کئی سالوں سے اس کی دوستیاں ختم ہو کر رہ گئی تھیں۔ سب اپنی اپنی زندگیوں اور دائروں میں گھمن

گھیاں کھارہے تھے۔ سعدی نے تو اسے جان بوجھ کر نظر انداز کرنا شروع کردیا تھا۔
وہ رات اس نے بہت مشکل سے گزاری تھی۔ اگلی صبح پہلی فرصت میں وہ بینک گیا تھا۔ تاکہ اپنا بیلنس وغیرہ چیک کرسکے اور یہ سب کرنے کے بعد اس کی پریشانی میں کئی گنا اضافہ ہوگیا تھا۔
"آپ کا کریڈٹ ہے پچاس ہزار نو سو روپے۔ خیریت ہے مرتضیٰ صاحب! آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔"
کیشیئر جو اسے جانتا تھا اس کے چہرے پر حزن و ملال کے گہرے سائے دیکھ کر پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ حالانکہ یہی خبر سنانے والا بھی وہی تھا۔ مرتضیٰ نے بہ دقت مسکرا کر اسے ٹالا اور بینک سے نکل آیا۔ اب کیا سبیل نکالی جائے اسے بالکل سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔
مصطفیٰ بھائی سے کچھ مانگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ خود نجانے کیسے اپنے دو بچوں کو پال رہے تھے۔ ان کے یہاں اولاد دیر سے ہوئی تھی۔ ان کے بچے ارتضیٰ سے بھی چھوٹے تھے۔ نسرین کے بھائی تو تھے ہی نکھٹو صرف باتیں کرنے میں ملکہ حاصل تھا —— ایسی صورت میں وہ روپے کس سے مانگ سکتا تھا اور کیسے مانگ سکتا تھا۔ یہ سب باتیں اس کی طبیعت کو بھی نڈھال کررہی تھیں۔ وہ چلتے چلتے ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ اس کی گاڑی تو کب سے اس کے بیٹے کے تصرف میں آچکی تھی۔ وہ آج کل لوکل ٹرانسپورٹ سے گزارہ کررہا تھا۔
کافی دیر وہیں بیٹھے رہنے کے بعد وہ گھر پہنچا تھا تو ایک دل دہلا دینے والی خبر منتظر تھی۔
"اس کی شاپ میں آگ لگ گئی تھی۔ لاکھوں کا مال پل بھر میں راکھ ہوگیا تھا۔" نسرین کے منہ سے یہ سب سن کر وہ دل پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔
"اب کیا ہوگا؟" یہ سوال جب کچھ دن پہلے نسرین نے اس سے پوچھا تو وہ اسے تسلی دیتے رہا تھا لیکن اب یہ سوال وہ بار بار خود سے پوچھ رہا تھا اور مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں اترتا جارہا تھا۔
اس کی شاپ انشورڈ نہیں تھی کہ وہ بے فکر ہو جاتا۔ اس کے لیے تو یہ زندگی اور موت کا مسئلہ تھا اور اب جب اسے ہاتھ جھاڑ کر بیٹھنا پڑ رہا تھا تو اسے مایوس ہونے کے سوا کوئی کام ہی نہیں آرہا تھا۔ اباجی اور اماں ہی آج کل اس کے پاس شہر آئے ہوئے تھے۔ کتنی ہی دیر تک وہ اور اباجی لان میں فولڈنگ چارپائی بچھا کر خاموشی سے بیٹھے رہے۔ ان کے پاس کہنے کے لیے کوئی الفاظ ہی نہیں تھے۔ اباجی کا جھریوں بھرا چہرہ اپنے بیٹے کے شکستہ چہرے کو دیکھ کر مزید لاغر لگنے لگا تھا۔ وہ انہیں بے حد عمر رسیدہ لگ رہا تھا۔ وہ بیٹھے ہی ہوئے تھے کہ گاڑی کا ہارن بجنے لگا۔ ارتضیٰ آچکا تھا۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ مری گیا ہوا تھا۔
"کیا ہوا؟..... کون مرگیا؟" اندر آتے ہی اس نے سب سے پہلے دادا اور باپ کی اتری شکل دیکھ کر سوال کیا تھا۔
"خدانخواستہ..... بچے ایسی باتیں نہیں نکالتے منہ سے کوئی مبارک کلمہ کہہ کر گھر میں داخل ہوتے ہیں۔"
اباجی بے ساختہ اسے ٹوک بیٹھے جبکہ ارتضیٰ کا چہرہ لال ہوگیا۔
"اپنے باپ سے کہہ دیں مجھے نصیحتوں سے سخت نفرت ہے۔" وہ انگریزی میں مرتضیٰ کی جانب دیکھ کر بولا اور پھر اپنے کمرے کی جانب چل دیا۔ پہلی بار اسے ارتضیٰ کی حرکت پر سخت غصہ آیا۔ چند منٹ بعد ہی وہ اس کے کمرے میں کھڑا تھا۔
"تمہیں کسی نے بڑوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں سکھائی؟"
"یہ بات آپ مجھ سے نہیں خود سے پوچھیے آپ نے مجھے جس طرح کا بلوٹ اپ کیا ہے میں اسی طرح کا ہوں ——— آپ مجھے اس طرح Brought up نہیں کرتے تو میں ایسا کبھی نہ ہوتا۔" وہ کندھے اچکا کر بولا تھا۔
"میں نے تمہیں بزرگوں کے ساتھ بدتمیزی کرنا نہیں سکھایا تھا۔" مرتضیٰ اپنے دکھ کو کنٹرول کرتے ہوئے بولا۔
"میں نے بزرگوں کے ساتھ کبھی بدتمیزی نہیں کی۔" اس کا انداز ویسا ہی تھا۔ وہ مرتضیٰ کی پروا کیے بغیر بستر پر دراز ہوچکا تھا۔
"جو تم ابھی اپنے دادا کے ساتھ کرکے آئے ہو اسے تمہاری زبان میں کیا کہتے ہیں؟"
"اگر وہ بدتمیزی تھی تو جو انہوں نے میرے ساتھ کیا وہ بھی بدتمیزی ہی تھی اور فار گاڈز سیک میرا دماغ مت کھائیے۔ میں پہلے ہی بہت تھکا ہوا ہوں۔"
وہ اوندھا ہو کر لیٹ گیا تھا۔ اس نے دروازہ بند نہیں کیا تھا لیکن بعض اوقات کسی کو دھکا دینے کے لیے دروازہ بند کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ مرتضیٰ نے اپنے بوجھل

ظل کو مزید بوجھل بنایا۔ اباجی کے ساتھ اس کا رشتہ کبھی بھی ایسا نہیں تھا کہ اسے وضاحتیں دینی پڑتیں لیکن ارتضیٰ کی بدتمیزی کے بعد وہ خواہ مخواہ انہیں وضاحتیں دینے لگا۔

☆ ☆ ☆

اباجی بھی اپنے بیٹے کے ہی باپ تھے اسی لیے اس کی وضاحتوں پر سرہلاتے گئے۔

"مجھے نہیں پتا میں نے زندگی میں ایسی کون سی غلطیاں کی ہیں جن کی سزا اب مجھے مل رہی ہے۔ ہر آنے والا دن میرے لیے مصائب کے انبار لا رہا ہے۔ مجھے آنے والے دن سے ڈر لگتا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ سورج ہی طلوع نہ ہوا کرے۔ میں اتنا برا انسان تو نہیں ہوں نسرین۔ میرے ساتھ یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟"

کمرے میں جب تنہائی کے علاوہ اس کی بیمار، غمگسار بیوی اس کے دکھ بانٹنے کی کوشش کر رہی تھی تو اس نے رقت بھرے لہجے میں کہا تھا۔ نسرین کے پاس اس کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ان دونوں کے پاس جب پاس کوئی جواب نہیں ہوتے تھے تو وہ خاموشی کی زبان میں غم بانٹنے کی کوشش کرتے تھے۔ نسرین بھی یہی کرتی رہی۔ وہ خود کافی پریشان تھی۔ گھر کے حالات، اس کی بیماری، کاروبار کا ختم ہو جانا اور ارتضیٰ کی خود سری سب چیزیں مل کر اس کے اعصاب کو کمزور بنا رہی تھیں۔ ارتضیٰ کھانا کھانے کے لیے بھی نہیں آیا تھا۔ وہ ٹرے سجا کر اس کے کمرے میں چلی گئی تھی۔ ممتا کے ہاتھوں مجبور تھی نا۔ اس کا خیال تھا کہ ارتضیٰ کو ساری باتیں تحمل سے سمجھائے گی مگر وہ سب کچھ سن کر بھڑک اٹھا تھا۔

"واٹ۔۔۔ شاپ جل گئی۔۔۔؟ بھٹی صاحب بے وقوف بنا رہے ہیں آپ کو۔ مما! وہ واقعی دولت پر سانپ بن گئے ہیں۔ وہ جانتے تھے نا کہ مجھے Lums میں ایڈمیشن لینا ہے تب ہی انہوں نے یہ ڈرامہ کیا ہے۔ اس کام میں تو ماہر ہیں وہ۔ ساری زندگی ڈراموں کے علاوہ انہوں نے کیا ہی کیا ہے۔ میں تو ان کے روز روز کے تماشوں سے تنگ آگیا ہوں۔ وہ مجھے پیسے نہیں دینا چاہتے، اس لیے ہر روز کوئی نیا کھڑاگ پیدا کر دیتے ہیں۔"

"میری جان! میرے بچے۔ ایسے مت سوچا کرو۔ بہت محبت کرتے ہیں وہ تم سے۔۔۔ تمہیں کچھ۔۔۔"

نسرین اسے سمجھا رہی تھی کہ لاڈلے نے بات کاٹ دی۔

"مما! ایسی جذباتی باتیں مت کیا کریں۔ میں با... وہ کتنی محبت کرتے ہیں مجھ سے۔ آپ کو یاد ہے چار سال پہلے جب ہم نے اوپر والا پورشن بنا کر گھر کے حصوں کا انٹیریئر بدلا تھا تب میرا کمرہ ڈیکوریٹ کرتے انہوں نے کتنی فضول چیزوں کا انتخاب کیا تھا۔ حالانکہ... نے ان کے کمرے کے لیے ہر چیز بہترین منتخب کی تھی۔ انہیں مجھ سے محبت ہوتی تو وہ ایسے کرتے؟ گزشتہ سالوں سے میں ان کی ایسی باتوں کو اگنور کر رہا ہوں... سے نہیں ہوتا۔ وہ اچھے باپ نہیں ہیں۔ باپ ... نہیں ہوتے۔ میں ان کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ لوگ ... بیٹوں پر جان چھڑکتے ہیں اور۔۔۔" وہ لمحہ بھر کے خاموش ہوا تھا۔

"میرا منہ مت کھلوائیں مما! مجھے خاموش رہنے ... مجھے وہ انسان اچھا نہیں لگتا جو ناانصاف ہو۔ وہ ... ساتھ ناانصافی کرتے ہیں۔"

اس کی آواز میں ٹین ایجرز والا جذباتی پن تھا۔ نسرین اسے سمجھانا چاہتی تھی، لیکن اس کی اپنی طبیعت ... بوجھل ہو گئی تھی کہ وہ وہاں سے اٹھ گئی۔ اس کے ... ارتضیٰ کے ہر سوال کا جواب تھا لیکن اسے سمجھانا ... کسی کے بس کی بات نہیں لگ رہی تھی۔

وہ باپ کی محبت کو مادہ پرستی کے ترازو میں تول رہا ... ایسے جیسے بچے سب سے زیادہ عیدی دینے والے انکل کو سب سے اچھا انکل کہتے ہیں، اسی طرح اس کا بیٹا باپ کے لیے ایک معیار مقرر کر چکا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو کیسے بتاتی کہ اس کا باپ جان بوجھ کر اس کے لیے "... چیزیں" پسند نہیں کرتا۔ وہ اگر اپنے لیے چیزیں لاتا تو وہ ... ہی ہوتی تھیں۔ ایک دیہاتی شخص کی پسند ناپسند اس ماڈرن بیٹے کے معیار پر کیسے پوری اتر سکتی تھی۔ ارتضیٰ کی باتوں کو برداشت کرتی وہ اب اپنے بستر پر لیٹی ارتضیٰ کی باتیں سن رہی تھی۔

نسرین کی بیماری بڑھتی جا رہی تھی۔ جس چیز کو ہیپاٹائٹس ہی سمجھا گیا تھا وہ دراصل لیور کا اسٹون تھا۔ ڈاکٹرز نے اسے آپریٹ کروانے کا مشورہ دیا تھا۔ مرتضیٰ کے پاس بخار کے علاج کے لیے پیسے نہیں تھے وہ لیور آپریشن کیسے کرواتا۔ کسی کے مشورے پر اس نے اپنا گھر

گروی رکھ کر اس پر قرضہ لے لیا جو پندرہ لاکھ مالیت کا تھا۔ رقم ہاتھ میں آجانے سے اسے کافی سکون نصیب ہوا۔ اگرچہ گھر گروی رکھ دینے کا افسوس تھا مگر گھر نسرین سے زیادہ اہم نہیں تھا۔ نسرین کے آپریشن کے ساتھ اس نے بقیہ رقم سے دوکان کو ریپیئر کروا کر وہاں مال ڈلوا لیا تھا۔ دوسری دکان کرائے پر تھی جس کا پانچ سال کے لیے کانٹریکٹ ہو چکا تھا۔ اس کانٹریکٹ سے جو رقم حاصل ہوئی تھی، اسی سے کچھ عرصہ پہلے اس نے اپنا گھر مرمت کروایا تھا۔

اسے لگ رہا تھا جیسے وہ نئے سرے سے زندگی کی ابتدا کر رہا ہے۔ زیرو سے سفر شروع کرنا واقعی بے حد مشکل تھا۔ خاص طور پر جب آپ ناامید بھی ہوں۔ نسرین اسے اور وہ نسرین کو امید دلانے کے لیے بلاوجہ باتیں کرتے رہتے ایسے جیسے ذیابطیس کے مریض انسولین کی ٹیبلیٹ لیتے ہیں۔ ارتضیٰ کی وہی مصروفیات تھیں بلکہ ان میں کسی قدر اضافہ ہو چکا تھا۔ اے لیولز کے بعد وہ فارغ تھا۔ اس کا زیادہ وقت دوستوں میں گزر جاتا۔ گھر ہوتا تو فون، موبائل فون یا انٹرنیٹ پر مصروف رہتا۔ اس نے اسموکنگ بھی شروع کر دی تھی۔ نسرین نے ایک روز کام والی ماسی سے گھر کی صفائی کے دوران سگریٹ کے کچھ ٹوٹے لیے تھے۔

"یہ چھوٹے صاب کے کمرے سے نکلے ہیں۔" ملازمہ نے ارتضیٰ کے کمرے کی جانب اشارہ کر کے کہا تھا۔ جب کہ نسرین نے اسے یہ بات کسی کو بتانے سے منع کر دیا تھا۔ اس کا خیال تھا مرتضیٰ کو بیٹے کی یہ حرکت مزید دکھ دے گی۔ وہ گاڑی میں سگریٹ کی ڈبیا اور لائٹر دیکھ کر پہلے ہی کھٹک چکا تھا کہ اس کا بیٹا سگریٹ نوشی کرنے لگا ہے۔ اس نے بھی یہ بات نسرین کو نہیں بتائی تھی کہ اس کے سبب صدمہ بھی ہو جانے کا خدشہ تھا۔ ارتضیٰ بھٹی صاحب کو ان دونوں کی ہی فکر نہیں تھی سو ایک روز رات کے کھانے کے بعد جب مرتضیٰ نے اسے کسی ضروری بات کی خاطر کچھ دیر وہیں بیٹھنے کے لیے کہا تو اس نے احسان کرنے والے انداز میں بیٹھ کر جیب سے سگریٹ نکال کر سلگا لیا تھا۔ نسرین اور مرتضیٰ ایک دوسرے کی شکل دیکھتے رہ گئے تھے۔

"سگریٹ پینا کوئی اتنا بڑا پرابلم نہیں ہے کہ آپ میری شکل ایسے دیکھنے لگیں، جیسے لوگ مرے ہوئے شخص کی دیکھتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا آپ مجھے زمانے کے ساتھ کیوں نہیں چلنے دیتے۔ میں کوئی چھوٹا بچہ تو نہیں ہوں، جس کی ہر حرکت پر اسے سرزنش کرنے والے انداز میں دیکھا جائے۔"

وہ بے انتہا چڑ گیا تھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے بیٹا! تم اپنی مما اور بابا کے بارے میں کچھ زیادہ ہی غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہو۔ دراصل اتنے کرائسز گزرے ہیں کہ سب ہی چڑچڑے ہو گئے ہیں۔ ایسا کرتے ہیں کل کہیں مل کر باہر چلتے ہیں۔ ڈنر باہر کریں گے۔ کیسا آئیڈیا ہے۔" مرتضیٰ خوش ہوتے ہوئے بولا۔ عرصہ ہی ہو گیا تھا انہیں اکٹھے کہیں باہر گئے۔ وہ امید بھری نظروں سے اپنے بیٹے کی جانب دیکھ رہے تھے۔

"آئم سوری، میں آپ کے ساتھ ڈنر کے لیے نہیں جا سکتا۔ کسی نے خدانخواستہ آپ کو پہچان لیا تو میرا کتنا مذاق بنے گا۔ میرے جس فرینڈ کو آپ کا پتا چل جاتا ہے وہی مجھے مسخرے کا بیٹا کہہ کر چڑانے لگتا ہے۔ مجھے مذاق بننے سے بہت ڈر لگتا ہے۔ مجھے تو معاف رکھیں آپ۔"

وہ تلخ لہجے میں بولا تھا۔ نسرین نے مرتضیٰ کی جانب دیکھا اور پھر سر جھکا کر ٹیبل پر پڑے برتن اٹھانے لگی۔ یہ اب ان کے لیے معمول کی بات تھی۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ مرتضیٰ کے سامنے بیٹے کو کم سے کم مخاطب کرے تاکہ بعد میں مرتضیٰ کے سامنے یہ تاثر پیدا کر سکے کہ ارتضیٰ اس کے سامنے روڈ ہوتا ہے مگر اکیلے میں اپنے باپ سے بہت محبت جتاتا ہے۔ لیکن جب کبھی وہ ایک ساتھ اس سے بات کرنے کی غلطی کرتے تھے تو ایک دوسرے سے نظریں چراتے پھرتے تھے۔

☆ ☆ ☆

"مجھے LUMS میں ایڈمیشن لینا ہے۔" وہ باپ کے سامنے بیٹھا خود سر لہجے میں بولا تھا۔

"LUMS میں۔۔۔ وہ تو بہت مہنگا۔۔۔" مرتضیٰ نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ وہ چیخ اٹھا۔

"مجھے پتا تھا۔ میں جانتا تھا، آپ یہی کہیں گے۔ آپ میری خوشیوں کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ آپ مجھے خوش دیکھنا ہی نہیں چاہتے، اسی لیے میری ہر بات سے

انکار کردیتے ہیں۔"

"میں نے انکار تو نہیں کیا۔ میں تو صرف یہ۔۔۔" وہ بیزار لہجے اور اکھڑتی سانسوں کے درمیان بولا تھا۔

"یہ انکار ہی ہے جناب۔۔۔ اور انکار کسے کہتے ہیں۔ ٹھیک ہے ایسے تو ایسے ہی سہی' میں بھی پڑھائی چھوڑ دوں گا۔ LUMS کے سوا تو مجھے کہیں نہیں پڑھنا۔ میرے سب دوست وہیں ایڈمیشن لے رہے ہیں۔ ایڈیوٹس۔"

وہ پاؤں پٹختا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ مرتضیٰ نے اپنے بیٹے کی جانب دیکھا' اس کے لیے اس کی اولاد سب سے بڑا بلیک میلر ثابت ہو رہی تھی۔ وہ اس کا بیٹا تھا مگر کسی ڈراؤنے خواب سے کم نہیں تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ اسے اس ڈراؤنے خواب سے محبت بھی بہت تھی۔ اس نے نسرین سے بات کی تو اس نے قطعیت بھرے لہجے میں انکار کر دیا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے اس بار اس کی بات ماننے کی۔ کچھ زیادہ ہی خود سر ہو گیا ہے یہ' اگر اس کے سب فرینڈز LUMS میں ایڈمیشن لے رہے ہیں تو ہم کیا کریں' ہم نہیں افورڈ کر سکتے۔"

"وہ بچہ ہے' بچے ضد کرتے ہی ہیں۔ تم اسے پیار سے سمجھاؤ۔" مرتضیٰ منت بھرے لہجے میں بولا تھا۔

"وہ پیار کی زبان سمجھتا ہی کب ہے؟" نسرین نے یہ بات دل میں سوچی تھی۔ وہ خود ارتضیٰ سے خائف رہنے لگی تھی۔ اس نے سوچا تھا' وہ رات کو اس سے بات کر کے دیکھے گی مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔ وہ رات کو گھر نہیں آیا تھا۔ اس سے پہلے وہ رات کو بتائے بغیر کبھی غائب نہیں ہوا تھا۔ ان کے پاس اس کے دوستوں کے جتنے نمبرز تھے' ان سب پہ فون کر کے وہ پتا کر چکے تھے۔ وہ وہاں کہیں نہیں تھا۔ اس کے سیل فون پہ کوئی رسپانس نہیں تھا۔

صبح آٹھ بجے کے قریب وہ گھر آیا تھا۔ اور ان دونوں کو نظر انداز کر کے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا تھا۔ ایک گھنٹہ بعد انہوں نے اسے سوٹ کیس لیے کمرے سے باہر نکلتے دیکھا۔

"میں آپ کا گھر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ میں ایسی جگہ نہیں رہ سکتا جہاں پیرنٹس اولاد کو قربانی کا بکرا سمجھیں۔

آپ میرے باپ نہیں' بلیک میلر ہیں۔ میں نفرت کرتا ہوں آپ سے۔"

وہ گیٹ کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ مرتضیٰ تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے سامنے آ گیا۔

"ایسے مت کہو ارتضیٰ۔۔۔ میرے چاند۔۔۔ اتنی سی بات پر گھر چھوڑ دو گے۔ میں تمہیں دلواؤں گا LUMS میں ایڈمیشن۔ میں نے کہا نا' میں دلواؤں گا۔ چلو آؤ یہاں بیٹھو۔"

وہ اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا تھا۔ کافی منت سماجت کے بعد ارتضیٰ نے ان دونوں پر احسان عظیم کرتے ہوئے گھر سے جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو! جی میں مسلم پورہ تھانے سے بول رہا ہوں' یہ بات کریں۔" رات کے اڑھائی بجے تھے جب فون کی گھنٹی بجی۔ فون نسرین نے اٹھایا تھا۔

"ممّا! انہوں نے مجھے اریسٹ کر لیا ہے۔ مجھے یہاں سے چھڑوا لیں۔۔۔ میرے سب۔۔۔" ارتضیٰ کی بات ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ ریسیور اس سے چھین لیا گیا۔

"بی بی! آپ کا بیٹا لڑکیوں کو چھیڑتا پکڑا گیا ہے۔ آپ کسی مرد کو تھانے بھجوا دیں۔"

اتنا کہہ کر فون کھٹاک سے بند ہو گیا۔ نسرین نے ہمت مجتمع کر کے مرتضیٰ کو جگایا تھا۔

ارتضیٰ انہیں کمبائن اسٹڈی کا کہہ کر گیا تھا اور صبح واپس آنا تھا اسے مگر اب اس فون نے انہیں دہلا کر رکھ دیا۔ مرتضیٰ نے اٹھ کر ادھر ادھر فون کیے۔ پھر تھانے پہنچا تو ارتضیٰ حوالات میں بند تھا۔ صبح کے چھ بج رہے تھے۔ تھانے کا عملہ بھی اونگھنے میں مصروف تھا' ایس ایچ او نے اسے دیکھ کر ناک چڑھاتے ہوئے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مرتضیٰ نے کبھی ایسے حالات کا سامنا نہیں کیا تھا۔ ہمیشہ ہی ایک نیٹ زندگی گزاری تھی اس نے اور اب اولاد کی وجہ سے اسے کیسی ذلت اور خواری کا سامنا تھا۔ ایس ایچ او ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ ادھر ادھر کی چند باتوں کے بعد وہ مرتضیٰ کو پہچان گیا تھا۔

"آپ ایکٹنگ شیکٹنگ کرتے ہو نا۔"

مرتضیٰ نے سر ہلا کر اعتراف جرم کیا۔

"دیکھیں جی۔ آپ کا بیٹا اور اس کے دو دوست لڑکیوں

کے ساتھ چھیڑ خانی کر رہے تھے۔ پہلے تو یہ ایک اخلاقی جرم ہے بابی۔ اس کی سزا الگ ہے اور پھر ہم انہیں یہاں لے آئے ہیں تو اتنی آسانی سے تو نہیں چھوڑیں گے۔ سویرے سویرے گھما پھرا کر بات نہیں ہوتی مجھ سے۔ کیا نام بتایا آپ نے اپنا۔۔۔ پانچ لاکھ دے دیں تو ابھی چھوڑ دیتا ہوں۔ ورنہ کیس تو لمبا ہے۔"

اس نے بہت اطمینان سے مطالبہ دہرایا تھا۔ مرتضیٰ پریشانی سے پہلے ہی ادھ موا ہوا جا رہا تھا۔ اس بات پر تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

"پانچ لاکھ۔۔۔ یہ تو بہت زیادہ ہیں۔ ایسا کیا کیا ہے ارتضیٰ نے۔"

اس کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ یہ سوال پوچھے' لیکن دل کے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔

"او جی آپ تو نے پانچ لاکھ دے دو۔ اتنے ڈرامے شرامے کرتے ہو آپ' اتنی اندھی کمائیاں ہوتی ہیں آپ لوگوں کی۔ بیٹے کی خاطر اتنا نہیں کر سکتے آپ۔"

وہ یقیناً "بلیک میلنگ" پر اتر آیا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ مرتضیٰ بیٹے کی خاطر اتنی رقم کا بندوبست کرنے کی کوشش ضرور کرے گا۔ آخر اب نہ سہی کبھی تو وہ ایک پبلک فگر رہا تھا۔ مرتضیٰ کی اپروچ اتنی نہیں تھی کہ وہ کسی جاننے والے کے ذریعے تھانے والوں پر دباؤ ڈلوا سکتا۔ اس کے کالج کے زمانے کے ساتھی بہت اچھی اچھی جگہوں پر پہنچ چکے تھے۔ لیکن مرتضیٰ کے ان سے ایسے روابط نہیں تھے کہ وہ بیٹے کی رہائی کے لیے ان سے رابطہ کرتا اور پھر یہ بات اتنی شرمندگی والی تھی کہ وہ کسی اپنے سے نہیں کر سکتا تھا۔ دوست تو پھر بیگانے تھے۔ کافی دیر تک ایس ایچ او سے بحث کے بعد معاملہ تین لاکھ میں طے ہو گیا۔

"آج شام تک بندوبست کر لیں۔ معاملہ اوپر چلا گیا تو تین لاکھ کے تیس لاکھ دینے پڑیں گے۔"

ایس ایچ او نے تاکید کی تھی' تین لاکھ اگرچہ اتنی بڑی رقم نہیں تھی' لیکن زندگی انہیں جن حالات تک لے آئی تھی وہاں تین لاکھ بہت بڑی رقم لگ رہی تھی۔ یہ اس کے لیے ایک اور کار دشوار تھا۔ مکان گروی' دکان بی' اور بینک بیلنس صفر تھا۔ نسرین نے اپنے سارے زیورات لا کر میز پر ڈھیر کر دیے جو "تقریباً" ڈیڑھ لاکھ مالیت کے تھے' اور نے پونے بکنے کے باعث ان کا "تقریباً" ایک لاکھ مل ہی گیا تھا۔ شرمندگی کے احساس سے چور چور وہ جن لوگوں کے سامنے

ہاتھ پھیلا سکتا تھا پھیلا دیے مگر مانگنے کے اس بدترین عمل کے باوجود وہ دوپہر تک تین لاکھ اکٹھے نہیں کر پایا تھا۔ پچھتر ہزار ابھی بھی کم تھے۔ کاروباری حلقے میں سب جانتے تھے کہ وہ کنگال ہو چکا ہے اس لیے اسے قرض دیتے وقت سب بڑی بڑی ضمانتیں مانگ رہے تھے۔ ہر طرف سے مایوس ہو جانے کے بعد اس نے ایک ساتھی اداکار کو فون کیا تھا۔ جو آج کل کمرشل تھیٹر سے وابستہ تھا۔

"میرے پاس اتنی بڑی رقم کہاں سے آئی ہے بھٹی صاحب! آپ ایسا کریں اب انتظار کریں' میں طاہر ملک سے بات کر کے آپ کو فون کرتا ہوں۔" اسے تسلی دی گئی تھی۔

آدھے گھنٹے بعد اس دوست کے بجائے خود طاہر ملک نے فون کیا تھا۔

"کیسے ہیں آپ بھٹی صاحب! مجھے خود فون کر لیا ہوتا۔ آپ نے ہمیں چھوڑا تھا' ہم تو آج بھی آپ کے منتظر ہیں۔"

اس کی بھاری بھرکم آواز اتنے سال گزر جانے کے باوجود آج بھی ایسی ہی تھی یعنی ناقابل برداشت' مرتضیٰ نے پہلے کبھی اس شخص کے سامنے جھکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ لیکن آج وہ مجبور تھا اور مجبوری بڑے بڑوں کو جھاگ کی طرح بٹھا دیتی ہے۔

"پچھتر ہزار تھوڑے نہیں ہوتے۔ دوسرا حالات آج کل ادھر کچھ اچھے نہیں رہے' خود ہی آ کر تفریح کرتے ہیں۔ مجرے دیکھتے ہیں۔ اور خود ہی چھاپے پڑوا دیتے ہیں۔ آپ خود سوچیں' ایسے حالات میں بھی ڈٹ کر کام کرتے رہنا جہاد کے برابر ہے کہ نہیں۔"

مرتضیٰ کا دل چاہا اسے بڑی سی گالی دے مگر وہی مجبوری جس کا نام ارتضیٰ تھا۔

"خیر' یہ باتیں تو ہم بعد میں بھی کر سکتے ہیں۔ اس وقت آپ کو بھی جلدی ہوگی۔ ایسا کریں۔ آپ میرے آفس آ جائیں۔ الحمرا والے آفس' باقی باتیں ہم بیٹھ کر طے کر لیتے ہیں۔ پچھتر ہزار کیش آپ کو مل جائے گا۔"

طاہر ملک کی باتوں سے ہی اس کے ارادوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ پچھتر ہزار کیش فراہم کر کے اس نے مرتضیٰ کو چھ ماہ کے لیے اپنی پروڈکشنز میں کام کرنے کا پابند کیا تھا۔

"اب حالات پہلے جیسے نہیں رہے۔ آپ کو تو پہلے بھی انتہائی شریفانہ جملوں پر اعتراض ہوا کرتا تھا۔ اب اس سے کہیں زیادہ کھلے جملے بولنے پڑتے ہیں۔ رقص کی

اناؤنسمنٹ بھی کرنا ہوتی ہے۔ عوامی تفریح کا پورا خیال رکھتے ہیں ہم۔ آپ سوچ سمجھ کر فیصلہ کرلیں۔ بعد میں بلاوجہ کی بحث سے مجھے بڑی الجھن ہوتی ہے۔"

پچیس ہزار کی رقم اس کے سامنے میز پر رکھ کر وہ بہت معصومیت سے کہہ رہا تھا۔ مرتضٰی نے منہ سے کچھ کہے بغیر ایگریمنٹ پر سائن کردیے۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت باقی رہی ہوتی تو وہ اس کے پاس آتا ہی کیوں۔"

☆ ☆ ☆

کچھ سال پہلے اس نے جس گندگی سے دامن چھڑا لیا تھا۔ ایک بار پھر اسے اسی گندگی میں قدم رکھنا پڑا تھا۔ پہلے ہی ڈرامہ میں اسے "ہیجڑے" کا رول دیا گیا۔ اس ذلت آمیز کام کے لیے اسے مکمل کاسٹیوم فراہم کیا گیا تھا۔ جسے دیکھ کر مرتضٰی شرم سے پانی پانی ہو گیا۔

وہ کتنی ہی دیر چست بھڑکیلے لباس اور دوسری چیزوں کو دیکھتا رہا' اس نے لباس پہننے سے پہلے میک اپ مین سے بہت کھرچ کھرچ کر شیو بنوائی تھی۔ اس ڈرامے کے لیے اس نے مونچھیں صاف کروادی تھیں۔ وہ "ہیجڑا" بن رہا تھا لیکن اسے عورت نظر آنے کی ہر ممکن کوشش کرنی تھی۔ لباس چڑھانے کے بعد اس کا میک اپ شروع ہوا تھا۔ اس کے ریگستان کی بھوری مٹی جیسے گالوں پر خوب غازہ ملا گیا تھا۔ اس کی بے جان شکوہ کناں آنکھوں کے اندر باہر رنگوں کی تہہ جمائی گئی تھی۔ اور پھر ہونٹوں پر لپ اسٹک کی موٹی تہہ جمادی گئی۔

ان سب چیزوں کے ساتھ جب اس نے اسٹیج پر انٹری دی تو وہ واقعی اندر سے مر چکا تھا۔ جو زنانہ لا کر اسے بولنے تھے 'وہ اس کے لباس کی طرح "بے لباسی" والا تاثر ہی لیے ہوئے تھے۔ وہ اس روز ذلت کی انتہا سے گزرا۔ سب سے بری بات رقص کے نام پر وہ مجرا تھا۔ جو ہر بیس منٹ بعد ان چیپ ڈائیلاگز کے درمیان زرق برق عجیب و غریب لباس پہنے کوئی نہ کوئی لڑکی آکر پیش کردیتی۔ اس دوران زیادہ تر مرتضٰی کو اسٹیج پر بڑے صوفے پر بیٹھ کر اس "مجرے" کو انجوائے کرنے کا تاثر پیش کرنا تھا۔ یہ کام سب کاموں سے مشکل تھا۔ اس رقاصہ کے چہرے اور جسم کے زاویوں پر نگاہ ڈالنا۔ اس کی آنکھوں میں چھپے گندے پیغامات کو انجوائے کرنا اور ہونٹوں پہ مسکراہٹ رکھنا۔ اسے مرنے کے برابر لگ رہا تھا۔ وہ فقط فرش کو ہی گھورتا رہا'

سامنے ہال کی جانب دیکھتا رہا جو کھچا کھچ بھرا تھا۔ یہی تو سب سے بڑا المیہ تھا کہ ہال کھچا کھچ بھرا تھا۔ چھوٹے بڑے' دبلے پتلے گورے سانولے' مرد ہی مرد اس ہال میں کیا کرنے آئے تھے۔ وہ ان چیپ جملوں کو بے حد انجوائے کررہے تھے۔ جو مرتضٰی اور دوسرے اداکار اسٹیج پر بول رہے تھے اور رقص میں تو ان کی جان ہی آگئی تھی۔

عورت کو اسٹیج پر اس طرح رقص کرتے دیکھ کر وہ سیٹیاں بجارہے تھے' گندے جملے کس رہے تھے اور نوٹ بھی برسا رہے تھے۔

یہ ایسے نہیں تو اور کیا ہے۔ کہ لوگ واقعی ہنس رہے تھے' قہقہے لگا رہے تھے خوش ہو رہے تھے۔

"یہ آدم زاد کون ہیں؟"

ایسی گھٹیا چیزوں میں "یہ" دلچسپی لے سکتے ہیں' لے سکتے ہیں تو کیسے؟"

کیا واقعی "یہ" اپنے دکھوں کا مداوا ان مجروں اور فحش جملوں میں ڈھونڈنے یہاں آتے ہیں؟

یہ رقم جو طوائفوں پر لٹائی جارہی ہے' کسی بھوکے کا پیٹ نہیں بھر سکتی تھی؟

کیا کسی کی چادر اتارنے کا نشہ کسی کو چادر پہنانے کے نشے سے زیادہ ہوتا ہے؟

کیا ایسے لوگوں کے جسموں میں روحیں ہوتی ہیں؟ اگر ہوتی ہیں تو ان روحوں کی سیاہی کیا عام سیاہی جیسی ہوتی ہے؟

اپنے سامنے تھرکتے ہوئے لاشے کو دیکھتے ہوئے وہ نجانے کیا کیا سوچتا جارہا تھا' رقص ختم ہوتے ہی ایک بار پھر اسے ایک تکلیف دہ عمل سے گزرنا تھا۔ اسے خود میں اور چارے میں کوئی فرق نہیں لگ رہا تھا۔ وہ وہی تکلیف محسوس کررہا تھا جو چارہ ٹوکے سے گزرنے میں کرتا ہوگا۔

ڈرامہ ختم ہوا تو وہ سب کے ساتھ گرین روم میں آگیا۔ پہلی بار اسے انسانی چہروں سے گھن محسوس ہوئی لیکن یہ احساسات گرین روم میں بیٹھے لوگوں کے لیے نہیں تھے بلکہ ہال میں بیٹھے لوگوں کے لیے تھے۔

دوسرے شو کے شروع ہونے میں ابھی ساڑھے تین گھنٹے باقی تھے۔ سب تیزی سے میک اپ صاف کرنے' کپڑے بدلنے یا طاہر ملک کے ساتھ پیسوں کے لیے جھگڑے میں مصروف تھے۔ ایک وہ تنہا جو اطمینان سے بیٹھا تھا۔ اس نے سر سے وگ اتارنے کے علاوہ اپنے اصل

حلیے میں واپس آنے کے لیے کچھ نہیں کیا تھا۔ اسے تینوں شو ختم ہونے کے بعد ہی گھر جانا تھا۔ بھوک اسے لگ نہیں رہی تھی۔ پیسے وہ پہلے ہی لے چکا تھا۔ سو اب ہاتھ جھاڑ کے بیٹھنے کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ اسی دوران ایک موٹی بھدی سی عورت اس کے ساتھ والی کرسی پر آبیٹھی۔ اس کی آنکھیں بھیگی بھیگی سی تھیں۔ مرتضٰی کو وہاں موجود کسی انسان سے دلچسپی نہیں تھی مگر اس عورت کے وجود پر چھائی تھکن اسے اس کی جانب متوجہ کرگئی تھی۔

"ہمیں انسان نہیں۔۔۔ سمجھتے ہیں۔" وہ ایک موٹی سی گالی دے کر بولی تھی۔

"کیا ہوا؟" وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔

"آپ کیوں پوچھ رہے ہو جی۔۔۔ آپ کیا کرسکتے ہو۔۔۔ خاموش بیٹھے رہو آپ۔۔۔ میرا دماغ پہلے ہی خراب ہے۔"

وہ تڑخ کر بولی۔ مرتضٰی شرمندہ ہوئے بغیر سامنے دیکھنے لگا۔ وہ پہلے ہی اتنا شرمندہ ہوچکا تھا کہ اب اس کے اندر شرمندگی پیدا کرنے والے خلیے ہی ختم ہوگئے تھے۔

"تا آپ مجھے ایک بات بتائیں۔۔۔ ادھر دیکھیں ذرا۔۔۔ میری طرف۔۔۔ آپ کو لگتا ہے میں اس۔۔۔ کی طرح ناچ سکتی ہوں۔۔۔ اسٹیج پر۔"

اس نے خالی جگہ پر پھر ایک موٹی گالی استعمال کی تھی۔

"میرا چھوٹا بچہ ہسپتال میں ہے۔۔۔ مجھے پانچ ہزار۔۔۔ نہیں دے رہا کمینہ۔ کہتا ہے ایک بار اسٹیج پر ناچ کر دکھاؤ۔۔۔ کوئی حاجی ہے جو اس ملک کا گہرا دوست ہے اور ہر ڈرامہ دیکھنے آتا ہے۔۔۔ ہر عورت کو دیکھ کر رال ٹپکنے لگتی ہے اس کی۔۔۔ طاہر نے اور اس نے شرط لگائی ہے کہ میں اسٹیج پر ناچ سکتی ہوں یا نہیں۔۔۔ اب آپ بتاؤ میں کیا کروں اور کیا نہ کروں۔۔۔ مجبوریوں نے تو ہمیں ذلیل کرکے رکھ دیا ہے۔۔۔ اس کی بات مانوں تو پانچ ہزار دے گا' ورنہ نہیں۔ آپ یقین کرو چاچا جی۔۔۔ میں بری عورت نہیں ہوں۔۔۔ میں باقی سب کی طرح علاقہ غیر کی نہیں ہوں جی۔"

وہ بات کرتے کرتے رونے لگی تھی۔ "علاقہ غیر" وہ کس جگہ کو کہہ رہی تھی۔ مرتضٰی کی سمجھ میں آگیا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ کہیں سے پانچ ہزار لا کر اس عورت کے ہاتھ پر رکھ دے جو عمر میں بڑی ہونے کے باوجود اس کو چاچا کہہ رہی تھی۔ افسوس اس بات کا تھا کہ اس کے پاس اتنے روپے تھے ہی نہیں۔

دوسرے شو میں مرتضٰی نے اس بے ہنگم عورت کو اسٹیج پر ناچتے دیکھا۔ وہ "ناچ" کے نام پر عجیب و غریب حرکتیں کررہی تھی اور ہال میں بیٹھے شائقین نے قہقہے لگا لگا کر چھت پھاڑ رکھی تھی جبکہ اسٹیج پر مرتضٰی کے علاوہ تین مزید اداکار موجود تھے۔ مرتضٰی نے ان سب کی آنکھوں میں تاسف کی پرچھائیاں دیکھیں۔ وہ سب یقیناً اس "عورت" کے حالات سے واقف تھے۔ تب ہی اس کے دکھ کو محسوس کرکے دکھی ہو رہے تھے۔

مرتضٰی پہلے اپنے دکھ پر پریشان تھا اور اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس سے زیادہ دکھی لوگ بھی اس فیلڈ میں خوار ہو رہے ہیں۔

☆ ☆ ☆

"کھانا کھائیں گے؟" نسرین نے نظریں جھکائے بے حد امید بھرے لہجے میں پوچھا تھا۔ مرتضٰی کے جھکے کندھے' مایوس آنکھیں اور سب سے بڑھ کر غمگین شیوہ چہرہ اسے ہر کمائی کی تفصیل سمجھا رہا تھا۔ وہ لاؤنج میں بھی نہیں بیٹھا تھا بلکہ سیدھا بیڈروم میں چلا آیا تھا اور اب بیڈروم میں بھی وہ بستر پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھا تھا۔ اس کی نظریں کبھی کبھی سامنے دیوار کی جانب اٹھتی تھیں اور پھر جھک جاتی تھیں۔ دیوار پر ایک آرٹ پیس نمایاں تھا جس پر سورۃ رحمٰن کی آیت لکھی تھی۔ وہ اس آیت کو دیکھتا تھا اور پھر شرمندہ ہو کر نظریں جھکا لیتا تھا۔

"چائے بنالاؤں؟" نسرین نے بے حد آزردہ ہو کر اس کی حالت دیکھی تھی۔ اسے اس شخص سے محبت تھی' اب سے نہیں' بہت بچپن سے تب سے جب اس شخص کی ہر ادا میں بجلیاں بھری ہوتی تھیں۔ قسمت نے اس شخص کو کہاں لا کھڑا کیا تھا۔ وہ اس کی جانب دیکھتی رہی پھر آنکھوں میں آئی نمی کو چھپانے کی خاطر اٹھ کر باہر چل دی۔

"نسرین! میرے پاس بیٹھ جاؤ۔۔۔ مت جاؤ خدا کے لیے۔" وہ دروازے کے قریب پہنچی تھی کہ لجاجت بھری آواز سنائی دی۔ وہ تڑپ کر مڑی اور مرتضٰی کے قریب چلی آئی۔

"میں کہیں نہیں جا رہی۔۔۔ مگر آپ ایسے مت بیٹھیں۔۔۔ میرے دل کو ہول اٹھتے ہیں۔" وہ اس کے پہلو میں بیٹھ کر اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر بولی تھی۔ مرتضٰی نے بس ایک نظر اس کی جانب دیکھا تھا پھر دوبارہ سے نظریں

جھکا کر اپنے ہاتھوں کی جانب دیکھنے لگا۔

"یہ سب بہت مشکل ہے... اتنا مشکل... کہ میں... تمہیں بتا نہیں سکتا... دیکھو انہوں نے... میرا کیا حال کر دیا... دیکھو میرا... چہرہ... میری جانب دیکھو نسرین..." وہ بولتا ہوا یکدم اس کی جانب مڑا تھا۔

"کیا میں ویسا ہی لگتا ہوں... جیسا صبح گھر سے نکلنے سے پہلے... لگ رہا تھا... نہیں نا... اب... میرا چہرہ مسخ ہو گیا ہو گا... میں بہت ذلت سے گزر کر آیا ہوں... بہت ذلت ہے... نسرین... بہت ذلت ہے... مجھے مرد نہیں رہنے دیا انہوں نے... مجھے کتا بنا دیا ہے... تم میرے ساتھ رہ لو گی نا... ایک کتے کے ساتھ رہنا... بہت ذلت آمیز ہے۔"

وہ ہوش کی دنیا سے کہیں بہت آگے نکلا ہوا لگ رہا تھا۔ نسرین نے اس کے سرد ہوتے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور انہیں گرم کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کا دل پہلے ہی بوجھل تھا۔ مرتضیٰ کی واپسی ساڑھے تین بجے ہوئی تھی اور ساڑھے تین بجے تک وہ آیت کریمہ کی تسبیح کرتی جلے پیر کی بلی کی طرح دالان میں ٹہلتی رہی تھی۔

"ایسی باتیں مت کرو... سب ٹھیک ہو جائے گا... اللہ اپنے بندوں کو اتنا نہیں آزماتا۔" وہ گلوگیر لہجے میں بہت ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھی۔

اس کی آنکھ سے آنسو ٹپکنے لگے تھے اور اس کے ہاتھوں کی گرفت نسرین کے ہاتھوں پر مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ وہ نسرین کی جانب دیکھنے لگا تھا۔ اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں اور چہرے پر بچوں کی سی معصومیت تھی۔

"مجھے عورتوں کے جیسے کپڑے پہننے کو دیے... مجھے بہت شرم آ رہی تھی... میرے گالوں، آنکھوں اور ہونٹوں پر اتنی سرخی لگا دی... مجھے روز یہی سب کرنا پڑے گا۔ ہر روز میں... یہی کام کروں گا... یہ گندا کام ہے... تم میرے لیے دعا... نہیں نہیں نا، میرے لیے دعا کرو..."

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔ نسرین نے اس کے گرد اپنی بازو حمائل کیے اور اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ اتنا زیادہ رو رہا تھا کہ ایک منٹ بعد ہی نسرین کا دوپٹہ بھیگ گیا تھا۔ نسرین بھی اس کے ساتھ رونے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

مجبوری کا نشہ، ہوش نہیں کرتا، مایوس کر دیتا ہے اور مایوسی انسان کو موت کی طرح بے حس کر دیتی ہے۔ وہ بھی بے حس ہو گیا تھا۔ حالات کی چکی نے پیس پیس کر اسے آٹا بنا ڈالا تھا۔

وہ اپنے آپ سے اس قدر لاپروا ہو چکا تھا کہ کھانے پینے کا ہوش بھی نہیں رہا تھا۔ پہلے کی طرح کسی چیز میں گرم جوشی سے حصہ لینا تو اسے بھول چکا تھا۔ گاؤں سے کوئی رشتہ دار ملنے کے لیے آ جاتا تو بیٹھا خاموشی سے اسے تکتا رہتا۔ مہمان بیچارا خود ہی بول کر تھک جاتا اور واپس چلا جاتا۔ طاہر ملک اسے مسلسل ڈراموں میں کام دے رہا تھا۔ ایک کے بعد ایک اسے ہر ڈرامہ میں ہیجڑہ یا اسی ٹائپ کا "کچھ" بننا پڑتا۔ اسی پر کیا موقوف، اسٹیج کی دنیا میں زیادہ تر اداکاروں کو ایسے ہی گھٹیا کردار نبھانے پڑ رہے تھے، جو اداکار اثر و رسوخ والے تھے وہ تو بچ جاتے تھے لیکن چھوٹے اور مجبور فنکار واقعی مجبوریوں کے بندھن میں بندھے تھے۔

جس ہفتے مرتضیٰ کے شوز چل رہے ہوتے، ان دنوں اس کی حالت لیبر پین میں مبتلا عورت کے جیسی ہو جاتی۔ آنکھوں میں موت رقصاں نظر آتی اور ہونٹوں پر جامد خاموشی جبکہ جسم کے باقی اعضاء حالت سجدہ میں گڑگڑاتے محسوس ہوتے تھے۔ جب وہ گھر واپس آتا تو نسرین کا دل چاہتا واقعی اسے دل کے کسی کونے میں چھپا لے۔

ارتضیٰ کے معمولات پہلے سے بھی بدتر ہو گئے تھے۔ حوالات کا چکر لگا لینے کے بعد وہ پہلے سے زیادہ ڈھیٹ ہو گیا تھا۔ وہ اس چیز کو ایڈونچر قرار دیتا تھا۔ اسے اس بات کی کوئی شرمندگی نہیں تھی کہ اس کے باپ نے اپنی روح گروی رکھ کر اسے حوالات سے چھڑوایا تھا۔ وہ ابھی بھی مرتضیٰ کے ساتھ پیسوں کے لیے بحث کرتا اور پھر طعنوں اور گالی گلوچ پر اتر آتا۔ "میرا باپ... ڈرامے باز... ایک ناکام آدمی ہے... اگر کسی کے گھر پیدا ہونے میں انسان کا اپنا اختیار ہوتا تو میں کبھی اس شخص کے گھر پیدا نہ ہوتا۔"

وہ نسرین کے سامنے حقارت سے کہا کرتا تھا اور وہ حیرانی سے سوچتی کہ تربیت میں کمی کہاں رہ گئی تھی جبکہ وہاں تربیت میں کمی نہیں تھی بلکہ سرے سے تربیت کے آثار ہی نظر نہیں آتے تھے۔ اپنے LUMS کے فرینڈز کے ساتھ وہ زندگی کو انجوائے کرنے میں لگا تھا اور دوسری جانب اس کا باپ گھل گھل کر مر رہا تھا۔

زندگی کی ڈگر وہی تھی، بس اب یہ ہوا تھا کہ مرتضیٰ کے اندر امید اور حوصلہ نہیں رہا تھا۔ وہ اتنا جل کڑھ چکا تھا کہ

اس کے اندر جلنے کڑھنے والا مواد ختم ہو گیا تھا۔ اب وہ معاشرے کی حالت دیکھتا اور افسردہ ہو جاتا۔ اسے لگتا تھا، اس کی اس حالت کا ذمہ دار کسی نہ کسی طرح یہ معاشرہ بھی ہے۔

لوگ جوق در جوق ان ڈراموں کو دیکھنے کے لیے آتے تھے۔ خواتین کے بیٹھنے کا الگ انتظام ہوتا تھا اور وہ حیرانی سے دیکھتا رہ جاتا کہ بہت سی عورتیں بھی ایسی چیزوں کی شوقین تھیں۔ ڈراموں کی آڑ میں جو کچھ ہو رہا تھا، ان گنت لوگ اس کو دیکھنے آتے تھے۔ وہ لوگ جو روپے خرچ کر کے ہال میں یہ سب دیکھنے آتے تھے، فقط "دیکھنے" سے ان کے نفس کا پیٹ نہیں بھرتا تھا، اس لیے وہ ٹھونک بجا کر دیکھنا چاہتے تھے۔ سو "یہ" انتظام الگ تھا۔ وہ اپنی آنکھوں سے عورتوں کو ذلیل ہوتے اور عزت دار لوگوں کو انہیں ذلیل کرتے دیکھتا اور پھر بے حسی کا لبادہ اوڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے کام میں لگ جاتا۔

ایک عجیب سی صورت حال تھی جو اسے ہر گزرتے دن کے ساتھ تھکاتی جا رہی تھی۔ وہ سب کام جو مخصوص علاقوں میں ہوا کرتے تھے، وہی کام اسٹیج کی آڑ میں کھلم کھلا ہو رہے تھے۔ اس کے پورے خاندان میں کبھی کسی نے لائیو مجرا نہیں دیکھا ہو گا جبکہ وہ یہ سب دیکھتا اور پھر اپنی تمام حسیات کے مردہ ہو جانے کی دعا کرنے لگتا۔

اس روز اس نے ایک طوائف کو اپنی سترہ سالہ بیٹی کے دام کھرے کرتے دیکھا اور یہ دیکھ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کو خریدنے والا اس کا کالج فیلو طلحہ نیازی تھا۔ طلحہ نیازی میانوالی میں کتنی اچھی پوسٹ پر کام کر رہا تھا، یہ کسی سے بھی ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ اس نے خوشبوؤں کی طرح مہکتے اس شخص کو ایک طوائف کا سودا کرتے دیکھا اور پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔

جن دنوں وہ اپنی مرضی سے اسٹیج کر رہا تھا، ان دنوں طلحہ نیازی اسے بہت بری طرح اگنور کرنے لگا تھا اور ایک بار اس نے اعتراف بھی کیا تھا کہ وہ اسٹیج پر اس قسم کے گھٹیا کام کرنے والے سے دوستی کیا، سلام دعا بھی نہیں رکھنا چاہتا۔ اس کا اشارہ "ایکٹنگ" کی طرف تھا اور اب جو کچھ وہ خود کر رہا تھا، اس کے لیے پتا نہیں اس نے کوئی سزا مقرر بھی کی تھی یا نہیں۔

وہ طلحہ نیازی کو وہاں دیکھ کر اتنا بے چین ہوا کہ گرین روم سے اٹھ کر میک اپ روم میں آ گیا کیونکہ وہاں بے حد رش لگا تھا اور وہ کچھ لمحے صرف اپنے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔ اسے بیٹھے کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ رانا اکمل بھی ادھر آ گیا۔ رانا اکمل گورا چٹا اور بہت دبلا سا لڑکا تھا۔ وہ "عورت" کے گیٹ اپ میں ہی تھا۔

"بھئی صاحب! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" وہ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی مصنوعی پلکیں اتارتے ہوئے اس سے سوال کر رہا تھا۔

"عاقبت بگڑ چکی ہے، باقی تو سب خیریت ہے۔" مرتضیٰ کے منہ سے پھسلا تھا۔ اکمل نے آئینے میں سے ہی اس کی جانب دیکھا اور بہت غور سے دیکھا۔ پلکیں اتار کر اب وہ جیولری اتار رہا تھا۔

"آپ نے یہ سب کچھ دل سے قبول نہیں کیا... ہے نا؟" دونوں بازوؤں سے وہ کانچ کی سرخ چوڑیاں اتار رہا تھا۔ کانچ کی چوڑیوں کے آپس میں ٹکرانے سے جلترنگ سی پیدا ہو رہی تھی۔ کسی کو اتنی خوبصورت آواز سے نفرت ہو سکتی ہے... شاید ہی... لیکن مرتضیٰ کو تھی۔

"تم نے کر لیا ہے؟" اس کے سوال کا جواب دیے بغیر مرتضیٰ نے پوچھا۔ وہ اب جھمکے کانوں سے چھڑا رہا تھا۔

"میرا دل ہی مر چکا ہے... مجھ سے آپ کیا پوچھتے ہیں... دل نہیں مرتا تو میرے بھولے چھوٹے بچے بھوک سے مر جاتے... اب میں کچھ نہیں سوچتا... جب شروع میں یہاں آیا تھا تو گھر واپس جا کر خوب روتا تھا... واش روم میں گھس جاتا... پانی کا نلکا کھول دیتا اور پھر دھاڑیں مار کر روتا... میری بیوی سمجھتی ہے، یہ بہت عزت والا کام ہے... بہت پرہیزگار عورت ہے... مجھے اس حلیے میں دیکھ لیا تو وہیں پھڑک کر مر جائے گی... اس کے پاس جاتا ہوں تو شرمندگی سے نظریں نہیں اٹھا پاتا... لیکن کیا کروں... مجھے اس کام کے علاوہ کچھ بھی نہیں آتا... زیادہ پڑھنے لکھنے کا شوق بھی نہیں تھا، بچپن سے ہی بس نقلیں شغلیں کرتا رہتا... پہلے پہل بہت اچھا کام مل جاتا تھا جس میں روح بھی خوش رہتی تھی اور دل بھی... اب تو نجانے لوگوں کو کیا ہو گیا ہے... جس ڈرامے میں ایسے ویسے ڈائیلاگ نہ ہوں تو ہال سے فرمائشیں آنے لگتی ہیں...

یہ سارے نام نہاد عزت دار لوگ اگر واقعی تفریح کی خاطر یہاں آتے ہیں تو ہم یہاں کیا جھک مار رہے ہیں... ہر ڈرامے میں اس امید پر چڑھتا ہوں کہ شاید اب کی بار مجھے یہ

سب نہ کرنا پڑے مگر ہر بار مایوسی ہوتی ہے۔ ہر بار ماں بہنوں کی گالیاں' گندے لطیفے اور گھٹیا حرکتیں۔۔۔ بھئی صاحب! آپ خود بتائیں' ہم یہ سب کیوں کرتے ہیں۔ یہ لوگ' یہ نام نہاد عزت دار لوگ ان چیزوں کو انجوائے کرتے ہیں تو طاہر ملک جیسے لوگ دھڑا دھڑ ایسی چیزیں پروڈیوس کر رہے ہیں۔ میرا ایک بھائی ہے' اس کی CDs اور DVDs کی دکان ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ اسٹیج والے مجروں کی CDs اتنی بکتی ہیں کہ بس۔۔۔ کیبل والے خریدتے ہیں اور پھر جب دل چاہتا ہے لگا دیتے ہیں۔۔۔ یہ ہے ہمارا معاشرہ بھئی صاحب! یہاں چینی مہنگی مگر عیاشی سستی ہے۔ لوگ بھیک مانگ کر گزارا کرتے ہیں مگر ہر گھر میں کیبل ضرور موجود ہے۔ موبائل ٹیکنالوجی سستی ہے اور آٹا دالیں مہنگی۔۔۔

اللہ قسم میں یہ نہیں کہتا کہ ہم اچھے لوگ ہیں مگر وہ لوگ جو یہ سب دیکھنے آتے ہیں' وہ ہم سے زیادہ گندے ہیں۔۔۔ بھئی صاحب! یہ لوگ اچھے ہو جائیں تو ہم کیوں اپنی روحوں کو ذلیل کریں۔۔۔ دھڑا دھڑ ڈرامے ہو رہے ہیں' ریکارڈنگز ہو رہی ہیں' سنیما ہاؤسز تیزی سے تھیٹرز میں تبدیل ہو رہے ہیں۔ پروڈیوسر اپنی ٹیمیں لے کر چھوٹے شہروں میں جا رہے ہیں' مجرے' جگتیں پھر بیہودہ گفتگو سے بھرے تماشے پیش کیے جا رہے ہیں۔ یہ سب کیا ہے بھئی صاحب اور یہ سب کیوں ہے۔"

وہ دونوں جلے سے انتہائی مضحکہ خیز لگ رہے تھے لیکن وہ دونوں ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر ہنس بھی نہیں رہے تھے' انہیں ہنسی آ بھی سکتی تھی۔ وہ دونوں کچھ دیر اسی طرح بیٹھے رہے۔ آج دو ہی شو تھے' اس لیے درمیان میں کافی وقت تھا۔

"المیہ یہ ہے بھئی صاحب! کہ اب ہم الیوں پہ نہیں روتے بلکہ ہنستے ہیں۔۔۔ یقین نہ آئے تو اپنے آپ کا تماشا بناتے ہوئے ذرا غور سے ہال میں دیکھ لیجئے گا۔"

رانا اکمل جھکے کندھے لیے اس کے پاس سے اٹھ گیا۔ مرتضیٰ نے اسے تسلی دینے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ جو کچھ کہہ گیا تھا' اسے اس کے لفظ لفظ پر یقین تھا۔ آج اس ہال میں اس کا آخری شو تھا' اس کے بعد پندرہ دن تک وہ فری تھا۔ پندرہ دن وہ اپنی دکان پہ ڈٹ کے لگانا چاہتا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ طاہر ملک کا قرضہ چکانے کے بعد دوبارہ کبھی اس جگہ کا رخ نہیں کرے گا۔ ارادے میں پختگی ہو' تب بھی لازم نہیں کہ وہ پورے ہو جائیں اور اگر ارادے فقط پختگی سے پورے ہوں تو پھر ان کے ٹوٹنے سے انسان خدا کو کیسے پہچانے۔

آخری شو معمول کے مطابق شروع ہوا تھا۔ ہر چیز ویسی ہی تھی جیسی ہو سکتی تھی۔

جب پہلا مجرا شروع ہوا تو وہ اسٹیج پر پڑے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ موٹی سی عورت خوب تھرک تھرک کر اپنے ہر عضو کی مدد سے سامنے بیٹھے شائقین کو لبھا رہی تھی۔ ایسے وقت میں مرتضیٰ ہال میں بیٹھے لوگوں کی جانب دیکھتا رہتا تھا۔ آج ہال میں عام دنوں سے زیادہ رش تھا کیونکہ آج اسٹوڈنٹس کچھ زیادہ ہی تھے۔ ایک منچلا گروپ زیادہ ہی بلابازی کر رہا تھا۔ مجرا پیش کرنے والی طوائف پر جو فقرے کسے جا رہے تھے' وہ بھی اسی گروپ کی سمت سے آ رہے تھے۔

رقص ختم ہوا تو ہال میں تالیاں اور سیٹیاں ایک ساتھ بجی تھیں۔ اسی گروپ کی جانب سے کسی نے کوئی فقرہ کسا تھا۔

"استغفراللہ۔" مرتضیٰ نے دل ہی دل میں توبہ کی اور ناگواری کو دل میں دباتے ہوئے اس سمت میں دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ پہاڑ لرزے تھے' نہ زمین ہلی تھی مگر زلزلہ آگیا تھا کیونکہ وہ جس کی جانب دیکھ رہا تھا' اسے وہ بہت اچھی طرح سے پہچانتا تھا اور وہ شخص میک اپ میں ہونے کی وجہ سے مرتضیٰ کو پہچان نہیں پایا تھا لیکن جتنے غور سے وہ مرتضیٰ کو دیکھ رہا تھا' اس سے پتا چلتا تھا کہ پہچان کا یہ مرحلہ چند لمحوں بعد سر ہو جائے گا۔

اس نے اپنے بائیں پہلو میں بے چینی کی عجیب سی لہر محسوس کی۔

☆ ☆ ☆

"تم ہو بہو بھئی صاحب کی کاپی ہو۔" طاہر ملک نے اس کو سر سے لے کر پیر تک گھورتے ہوئے کہا۔ ارتضیٰ خاموشی سے اس کی نظروں سے خائف اسی کی جانب دیکھتا رہا۔ اسے فون کرنے پر اس نے فوراً "ردے دینے کی ہامی بھری تھی اور اب ٹھیک ایک گھنٹہ بعد ارتضیٰ اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ اسے پہلے کبھی کسی نے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ اپنے باپ سے مشابہت رکھتا ہے۔ اسے اپنے لمبے قد' کسرتی جسم اور گورے رنگ پہ فخر تھا جبکہ اس کا باپ اس

سے بالکل برعکس تھا۔

"مجھے بہت افسوس ہے ان کی وفات کا۔۔۔ وہ ہمارا سرمایہ تھے۔۔۔ بہت کمال کے ایکٹر تھے۔۔۔ بہت ہی کمال کے۔۔۔ حافظہ بھی غضب کا تھا۔۔۔ سب سے آخر میں اسکرپٹ ان کو ملتا تھا اور سب سے پہلے یاد کر لیتے تھے۔ ان کی اداکاری پر حقیقت کا گمان ہوتا تھا۔"

وہ ہونٹ بھینچ بھینچ کر تعزیت کی کوشش کر رہا تھا جبکہ ارتضیٰ پہلو بدلنے میں مصروف تھا۔ اسے فقط کچھ رقم درکار تھی جو وہ اس شخص سے ادھار لینے کے لیے آیا تھا۔ مگر وہ صرف تایا مصطفیٰ کو بتا کر آیا تھا جنہوں نے اسے جلدی واپس آنے کے لیے کہا تھا۔ اس نے کبھی اپنے باپ کی نصیحت برداشت نہیں کی تھی مگر اب باپ کے مرنے کے بعد وہ ہر ایک کی نصیحت کو سننے بلکہ برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"جنازہ کتنے بجے ہے؟" طاہر ملک نے اس کی خاموشی سے اکتا کر پوچھا تھا۔

"نماز عشاء کے بعد۔۔۔ پونے نو ہو جائیں گے۔" وہ حلق میں آیا تھوک نگل کر بولا۔ اسے پہلی بار زندگی میں ہر شے سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔

"ہوں۔۔۔ دیکھو برخوردار۔۔۔ پانچ سات ہزار سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔۔۔ سال پہلے کی بات ہے، ہم یہاں ایک ڈرامہ کر رہے تھے تو وہی ایکٹر جس کی انٹری اسٹیج پر چل رہی تھی، اس کے باپ کے مرنے کی اطلاع آگئی۔ ہم نے فوراً دس ہزار کی رقم اپنے بندے کے ہاتھ شاید وہ بھجوا دی اور ڈرامہ ختم ہوتے ہی اس ایکٹر کو اطلاع ہوئی۔۔۔ بے حد مشکور ہوا۔۔۔ اگلا شو تین گھنٹے بعد تھا۔۔۔ میں نے اسے بڑا زور لگایا کہ جا بچے ماں کا جنازہ اٹھا آ مگر آفرین ہے بچی۔۔۔ میں کہتا ہوں آفرین ہے اس بچے پر۔۔۔ کہنے لگا 'نہیں ملک صاحب! رقم پہنچ گئی اب اپنی ذمہ داری پوری کر کے جاؤں گا۔' اگلا پورا شو اس نے اتنے حوصلے سے کیا کہ ہم سب حیران رہ گئے۔ مجال ہے جو اس نے آنسو ٹپکنے دیا ہو آنکھ سے۔۔۔ وہ تالیاں بجیں کہ کسی کے لیے نہ بجی ہوں گی۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس ایک بچی ہوا کرتی تھی۔۔۔ اب تو خیر کام نہیں کرتی۔۔۔ بوڑھی ہو گئی ہے۔۔۔ ایکٹنگ تو نہیں آتی تھی اسے۔۔۔ ملکہ رقص تھی۔۔۔ کیا بلا ناچتی ہوگی جیسا وہ ناچتی تھی۔۔۔ بڑے بڑے رئیس جیب خالی کر دیتے تھے۔ چھ ماہ پہلے کی بات ہے، وہ بھی اسٹیج پر تھی۔۔۔ رقص شروع ہوا تھا ابھی۔۔۔ اس کا باپ بیک اسٹیج بیٹھا پان کھا رہا تھا۔۔۔ دل کا دورہ پڑ گیا۔۔۔ اسپتال لے جانا پڑا۔۔۔ وہ وہاں رقص کرتی رہی پیچھے باپ کا کلمہ شہادت پڑھنے والا وقت ہو گیا۔۔۔ اس بچی نے بھی ذمہ داری کا ثبوت دیا۔۔۔ ڈرامہ پورا کیا پھر باپ کے جنازے میں گئی۔۔۔ اسٹیج کی دنیا ہی ایسی ہے۔۔۔ بڑی ہمت چاہیے یہاں آنے کے لیے۔۔۔ وہ کون ہے اپنا شیخ زبیر۔۔۔ کیا خوبصورت بات کہتا ہے انگریزی میں۔۔۔ دنیا ایک اسٹیج ہے بھائی اور ہم سب اداکاری ہی تو کرتے ہیں۔"

وہ شاید شیکسپیئر کو شیخ زبیر کہہ رہا تھا۔

"شیخ زبیر بھی ایک بڑا آدمی تھا تمہارا باپ بھی کسی سے کم نہیں تھا۔ موت بڑا چھوٹا نہیں دیکھتی، اسے تو آنا ہی ہوتا ہے۔۔۔ مرنا برحق ہے۔۔۔ اصول ہے نا۔۔۔ جو اس دنیا میں آیا وہ مر کر ہی جائے گا۔۔۔ سب ہی ایک نہ ایک دن مر جاتے ہیں۔۔۔ ویسے بھٹی صاحب کو ہوا کیا تھا؟"

اسے یکدم جیسے اصل بات یاد آگئی۔

"ہارٹ اٹیک۔" وہ سر جھکا کر بولا۔ اس کو ڈر تھا کہ کہیں اس کی آنکھوں سے اس کے باپ کی موت کی اصل وجہ نہ جان لے۔ کسی کو پتا نہ چل جائے کہ ہارٹ اٹیک تو بہانہ ہے، بس اصل وجہ تو وہ خود تھا۔

"ہوں۔۔۔ ان کی صحت ویسے پہلے سے خراب رہنے لگی تھی مگر یہ حالات نہیں تھے کہ راتوں رات کوچ کر جاتے۔ ابھی ساڑھے تین بجے تو میں ان سے ملا تھا۔۔۔ گیٹ اپ میں تھے۔۔۔ میں نے ایک دو مذاق کر لیے۔۔۔ لوگ انہیں ہیجڑے کے رول میں بہت پسند کرتے تھے۔۔۔ اسی کا گیٹ اپ تھا۔۔۔ میری باتیں سن کر خاموش رہتے تھے۔۔۔ پہلے سے کافی کم گو ہو گئے تھے۔۔۔ مگر اسٹیج پر وہ جگتیں مارتے تھے کہ ہنس ہنس کر سارا زمانہ پیٹ پکڑ لیتا تھا۔"

اسے پھر اصل موضوع بھول گیا۔ ارتضیٰ کو باپ کا گیٹ اپ یاد آیا۔ اسے وہ باتیں یاد آئیں جو اس کے اور اس کے باپ کے درمیان ہوئی تھیں۔

"طاہر صاحب! مجھے ذرا جلدی ہے، میرا کام ذرا جلدی کروا دیں پلیز۔"

وہ درخواست کر رہا تھا۔ باپ کے چلے جانے سے اسے کیسے کیسے لوگوں کے آگے ہاتھ جوڑنے پڑ رہے تھے۔

"ہم سب جلدی میں ہوتے ہیں بچے۔۔۔ خیر۔۔۔ کتنا ہے تمہارا؟"

طاہر ملک کے چہرے کے تاثرات بدلے بدلے لگ رہے تھے۔ اس نے اپنا نام بتا دیا۔

"مجھے کما پھرا کر بات نہیں کرنی آتی برخوردار! روپے میں اسے دیتا ہوں مگر بھٹی کی موت سے میرا جو نقصان ہوا ہے، اسے کون پورا کرے گا۔ کسی نہ کسی کو تو اسے پورا کرنا ہی ہے۔"

وہ ٹیبل کی دراز سے روپے نکال کر اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ بہت کچھ سمجھتے ہوئے بھی ناسمجھی کے انداز میں اس کے چہرے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ لباس ہمیشہ اتنی نہیں ہے، کبھی کبھی وہ انسان کو الٹا دیتی ہے۔ ارتضیٰ بھٹی آج تک جس زمین پر مضبوطی سے قدم جمائے کھڑا تھا، وہ اس کے قدموں کے نیچے سے کھینچ لی گئی تھی۔

✿ ✿ ✿

اس نے زندگی میں کبھی کوئی چوری نہیں کی تھی لیکن وہ اپنے گھر میں ایسے داخل ہوا تھا جیسے چور داخل ہوتے ہیں۔ اس کی توقع کے عین مطابق لاؤنج کی لائٹ آن تھی اور ارتضیٰ کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اس نے شاید گیٹ کھلنے کی آواز سن لی تھی، تب ہی وہ اس طرح سے چلانے لگا تھا۔ مرتضیٰ نے لرزتے ہاتھوں سے گیٹ بند کیا اور بائیں پہلو میں ہونے والی بے چینی کو نظر انداز کر کے دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا لان عبور کرنے لگا۔ رات کافی سے زیادہ گزر چکی تھی، تب ہی چاند کی جوانی عروج پر تھی۔ روشنی ہوتے ہی اس کا سحر ختم ہو جاتا تھا، اس لیے وہ اپنی تمام تر روشنی اس لمحے دنیا پر نچھاور کر دینا چاہتا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی جس میں رات کی رانی کی مہک شامل تھی۔ ان سب چیزوں کے ساتھ ارتضیٰ کی آواز بھی تھی جو اس کے سست قدموں کو مزید سست کر رہی تھی۔

"میرا دل چاہتا ہے، میں مر جاؤں۔۔۔ اس گھر میں نہ رہوں، اس دنیا میں نہ رہوں، اس شخص کے سامنے نہ رہوں۔"

مرتضیٰ نے لاؤنج کے جالی والے دروازے سے اندر کی جانب دیکھا۔

"تم آرام سے بیٹھ کر میری بات کیوں نہیں سن لیتے۔۔۔ تمہارا باپ پہلے ہی بہت پریشان ہے، خدا کے لیے اسے مزید پریشان مت کرنا۔ میں تمہیں سب بتا دیتی ہوں۔" نسرین اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"وہ پیدائشی پریشان ہیں، میں نے انہیں کبھی پرسکون نہیں دیکھا۔۔۔ جن لوگوں کو پریشان ہونے کا شوق ہو وہ ہر پریشان ہی رہتے ہیں۔۔۔ ڈرامہ باز ہیں وہ۔ آپ کے میرے سامنے ڈرامے کرتے ہیں۔۔۔ وہاں ہال میں آپ دیکھتیں انہیں۔۔۔ ممالہ میں آپ کو کیسے بتاؤں۔۔۔ وہ کیا لگ رہے تھے۔۔۔ آپ انہیں دیکھ لیتیں تو واقعی شرم سے مر جاتیں۔"

مرتضیٰ چلانے لگا تھا۔ نسرین نے اپنا سر ہاتھوں میں تھام لیا۔ مرتضیٰ لاؤنج کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ قیامت تب تک قیامت رہتی ہے، جب تک سامنے نہ آجائے۔ ارتضیٰ نے کھا جانے والی نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ وہ نظریں چراتا اپنے کمرے کی جانب بڑھنے لگا تھا مگر ارتضیٰ نے اسے روک لیا۔

"میں جانتا ہوں تم کیا کہنا چاہتے ہو۔۔۔ تم جو سوچتے ہو، مجھے جیسا بھی سمجھتے ہو۔۔۔ میں ویسا ہی ہوں۔۔۔ بالکل ویسا۔۔۔ میں اچھا انسان نہیں ہوں۔۔۔ تم ٹھیک کہتے ہو، میں واقعی ڈرامہ باز ہوں۔۔۔ میں بہت تھکا ہوا ہوں۔۔۔ مجھے سو لینے دو۔۔۔ مجھے آج کی رات سو لینے دو۔۔۔ میں صبح تم سے تفصیلی بات کر لوں گا۔"

وہ بہت لجاجت بھرے لہجے میں بولا تھا۔ ارتضیٰ کو پتنگے لگ گئے۔

"تم واقعی اچھے انسان نہیں ہو۔۔۔ تم ایک نفسیاتی کیس ہو۔۔۔ ایسا کرنے سے نجانے تمہاری کون سی حس کو تسکین ملتی ہے۔۔۔ ماما! آپ اس شخص کی ڈھٹائی دیکھیں۔۔۔ کتنے آرام سے اعتراف کر لیا کہ میں ایک ڈرامہ باز ہوں۔۔۔ یہ ہمارے سامنے ہمیشہ معصوم بن جاتا ہے۔۔۔ غلط کام کر کے تو تھکن ہوگی۔"

اس کا انداز تخاطب اس قدر بدلا ہوا تھا کہ نسرین کو ٹوکنا پڑا۔

"اپنے بابا سے اس لہجے میں بات مت کرو ارتضیٰ!"

"نہیں ہے یہ میرا باپ۔۔۔ باپ ایسے نہیں ہوتے۔۔۔ جنہیں اپنی عزت کا خیال ہو نہ اولاد کی عزت کا۔۔۔ انہوں نے مجھے ہمیشہ ذلیل کروایا ہے۔۔۔ ہمیشہ۔۔۔ ان کی وجہ سے میں لوگوں سے ملنے سے کتراتا ہوں کہ کہیں کوئی یہ نہ پوچھ لے کہ میرا باپ کیا کرتا ہے۔ اچھا بھلا میں مطمئن تھا کہ دکانداری میں لگ گئے ہیں مگر جن کے دماغ خراب ہو جائیں، انہیں عزت راس نہیں آتی۔۔۔ یہ کسی عزت

کے مستحق نہیں ہیں۔"
مرتضیٰ نے یکدم سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا پھر وہ نسرین کو دیکھنے لگا۔
"اس سے پوچھو' یہ وہاں کیا کر رہا تھا؟" اس نے گہری سانس لیتے ہوئے نسرین سے کہا۔
"میں وہاں تمہارا جنازہ پڑھ رہا تھا.... یہی سننا چاہتے تھے نا.... میرا دل چاہتا ہے' میں مر جاؤں یا تم مر جاؤ تاکہ ہم دوبارہ کبھی ایک دوسرے کی شکل نہ دیکھ سکیں.... کبھی بھی نہیں۔"
وہ اب بھی چلا کر بولا تھا۔ مرتضیٰ نے مدد طلب نظروں سے نسرین کی جانب دیکھا۔
"مجھ سے پوچھو' یہ وہاں کیا کر رہا تھا.... یہ وہاں پیسے کما رہا تھا۔ اس لیے نہیں کہ اسے پیسہ اپنے لیے چاہیے بلکہ اس لیے کہ وہ تمہاری کسی بات کو رد کرنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ تمہارے لیے پیسہ بنا رہا تھا وہ وہاں...."
"بھئی صاحب پیسہ کے لیے یہ سب نہیں کرتے۔ کوئی پیسہ کے لیے اس غلاظت میں نہیں اتر سکتا' کوئی پیسہ کے لیے یہ گھٹیا کام نہیں کر سکتا۔ کوئی پیسہ کے لیے اپنا تماشا نہیں بنوا سکتا۔"
"بنوا سکتا ہے....
اولاد کی خاطر انسان بہت کچھ بنوا سکتا ہے.... میں تمہاری خاطر اپنی کھال کی جوتیاں بنوا سکتا ہوں۔" مرتضیٰ کسی کی جانب دیکھے بغیر بولا تھا۔
"یہ دیکھیں...." ارتضیٰ نے آگے ہو کر اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔
"یہ میرے جڑے ہوئے ہاتھ دیکھیں اور معاف کریں مجھے.... میری خاطر کچھ نہیں کیا آپ نے.... میرے دوست مجھے وہاں زبردستی نہ لے جاتے تو شاید مجھے کبھی آپ کے کرتوتوں کا پتہ نہ چلتا۔ میرا ایک ایڈونچر آپ کی ذات کو میرے سامنے بالکل عیاں کر گیا ہے۔ آپ چلے جائیں میرے سامنے سے....
مرتضیٰ نے ایک بار پھر سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا اور پھر دیکھتا ہی رہا۔ وہ اس کی اولاد تھا' اس کا بیٹا' جسے پانے کی خاطر وہ در در کر دعائیں مانگتا تھا۔ وہی بیٹا آج اتنا بڑا ہو چکا تھا کہ اسے بات کرنے کی تمیز بھی نہیں رہی تھی۔ مرتضیٰ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھا اور پھر کسی کی جانب دیکھے بغیر کمرے سے نکل گیا۔ بیڈروم میں داخل ہوتے ہی اس کی
سب سے پہلی نظر دیوار پر لگی سورۃ رحمٰن کی آیت پر پڑی تھی۔
"تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے۔"
یہ فریم شدہ آیت اسے سعدی نے دی تھی۔ ان دونوں وہ ٹی وی کا مشہور اداکار ہوا کرتا تھا۔ اس کے یہاں اولاد نہیں تھی جبکہ سعدی کی شادی ہو چکی تھی اور وہ دو جڑواں بیٹوں کا باپ تھا۔ سعدی نے کہا تھا کہ اس کو بیڈروم میں لگاؤ اور بھابھی سے کہنا۔ صبح شام اس آیت کی تسبیح کیا کریں اور صبح شام کی اس تسبیح نے اسے ارتضیٰ انعام کی صورت دیا تھا۔
"تمہارا بیٹا بہت پیارا ہے۔ شکر ہے تم پر نہیں گیا.... خدارا اس کے منہ پر انکل سعدی نہ چڑھا دینا۔ یار! کوئی تو ہو جو مجھے میرے صحیح نام سے پکارے۔ بھائیوں کے بچے مجھے چاچو سعدی یا ماموں سعدی کہتے ہیں۔ یہ مجھے انکل صدیق کہے گا۔"
سعدی جب ارتضیٰ کو دیکھنے آیا تو اس نے اسے گود میں لے کر کہا تھا۔ وہی ارتضیٰ جو گود میں بیٹھ کر معصومیت سے اسے "بابا" کہہ کر بلاتا تھا' آج اسے اس طرح مخاطب کر رہا تھا جیسے وہ گلی کا کتا ہو۔
وہ اپنے بیڈروم میں داخل ہو کر دھیرے سے چلتا بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اس کے ذہن میں ارتضیٰ کے فقرے گونج رہے تھے اور آنکھوں کے سامنے اس کا شعلے اگلتا چہرہ تھا۔ چند لمحوں بعد وہ بستر پر لیٹ گیا تھا۔ اسے اپنا سانس بہت تیز چلتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے بائیں پہلو میں ہونے والی بے چینی درد میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اسے یہ درد بہت معمولی محسوس ہوتے تھے۔ اس نے دایاں ہاتھ بائیں جانب سینے پر رکھ کر بہت آہستگی سے بہت نرمی سے سہلایا تھا۔ اسی دم نسرین کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اس نے ایک نظر دیکھنے کے بعد دوبارہ اس کی جانب نہیں دیکھا تھا۔ نسرین دھیرے دھیرے چلتی بیڈ کے قریب فرش پر بیٹھ گئی پھر اس نے اپنا سر مرتضیٰ کے قدموں میں رکھ دیا۔ اس کی سسکیوں کی آوازیں کمرے میں گونجنے لگی تھیں۔
"نسرین! مجھے ایسے ذلیل مت کرو۔" اس نے بہت دھیمی آواز میں کہا تھا۔ اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ اپنے پاؤں نسرین کے شکنجے سے چھڑا سکتا۔
"میری تربیت میں کہاں کمی رہ گئی تھی.... مجھے نہیں پتا۔ میں نے کہاں غلطی کی۔ آپ مجھے معاف کر دیں مرتضیٰ۔"

وہ سسک رہی تھی۔

"نسرین! الماری سے ارتضیٰ کے بچپن کی تصویروں والا البم نکال لاؤ۔"

اس نے شریک حیات کی بات کا جواب جیسے بغیر التجائیہ لہجے میں فرمائش کی تھی۔

"آپ ان تصویروں کو بھول جائیں۔۔۔ میں صبح ہی وہ سب تصویریں جلا دوں گی۔۔۔ جب زندہ انسان اپنے نہ رہیں تو تصویروں کو اپنا کے رکھنا بے کار ہے۔"

"پلیز۔۔۔ میں ان تصویروں کو دیکھنا چاہتا ہوں۔" اس کے لہجے میں التجائیہ عنصر بڑھ سا گیا تھا۔ کچھ دیر نسرین اس کی جانب دیکھتی رہی پھر وہ اٹھ کر الماری کی جانب بڑھ گئی۔

تصویروں والا ایک البم نہیں تھا بلکہ ارتضیٰ کی بے شمار تصاویر تھیں۔ مرتضیٰ کو ہر اہم موقع پر اس کی لاتعداد تصاویر اتارنے کا شوق تھا۔ البم کھول کر وہ بہت آہستگی سے تصاویر دیکھنے لگا۔ وہ ہر تصویر دیکھتا اور پھر ارتضیٰ کی تصاویر پر ہاتھ پھیرنے لگتا۔ اس کا انداز بے حد میکانکی تھی۔ نسرین نے حیرانی سے اس کی جانب دیکھا۔ "آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟" اس نے بغور مرتضیٰ کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا تھا۔ مرتضیٰ اس تصویر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ جب ارتضیٰ نے اسکول جانا شروع کیا تھا۔ نسرین کے سوال پر اس نے نظروں کا زاویہ بدل کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر بہت میٹھی سی مسکراہٹ تھی۔

"میرا بیٹا۔۔۔ یہ میرا بیٹا ہے۔۔۔ ارتضیٰ بھٹی۔" وہ تصویر کی جانب انگلی سے اشارہ کر کے بولا تھا۔ نسرین اس کے بالکل قریب ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کے دل میں عجیب عجیب سے خیالات آنے لگے تھے۔ وہ دونوں کافی دیر تک اسی طرح بیٹھے رہے۔ مرتضیٰ تصویروں کو اور نسرین مرتضیٰ کی جانب دیکھتی رہی۔ مرتضیٰ ایک کے بعد ایک البم کھولتا جا رہا تھا۔ دور کہیں مرغ کے بانگ دینے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ نسرین نے اکتا کر وہ ساری البمز مرتضیٰ کے آگے سے ہٹا لیں۔ وہ چاہتی تھی۔ مرتضیٰ جی بھر کر دل کی بھڑاس نکال لے مگر وہ منہ سے کچھ بول نہیں رہا تھا۔

"ابھی۔۔۔ میرے پاس رہنے دو انہیں۔۔۔ پلیز۔۔۔" وہ ایک البم کو سینے سے لگا کر بولا تھا۔ نسرین بے ساختہ رو پڑی۔ اسے روتا دیکھ کر مرتضیٰ نے فوراً البم چھوڑ دی۔ نسرین نے وہ البم اٹھا کر دور پھینک دی۔

"نسرین! مجھے سلا دو۔۔۔ مجھے نیند نہیں آتی۔۔۔ مجھے تھوڑی دیر کے لیے سلا دو۔"

اس کے انداز بالکل بچکانہ تھے۔ نسرین محبت سے آگے بڑھی۔ مرتضیٰ نے اپنا سر اس کے زانو پر رکھ دیا۔ وہ بہت پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں چلانے لگی۔ ہر عورت بالآخر صرف ماں ہو جاتی ہے۔ اسے لگ رہا تھا' مرتضیٰ چھوٹا سا بچہ ہے جسے وہ لوری دے رہی ہے۔ مرتضیٰ نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے چہرے پر دھیرے دھیرے سکون پھیل رہا تھا۔ جب نسرین کو لگا کہ وہ سو چکا ہے تو اس نے بہت آہستگی سے جھک کر اس کے ماتھے کو چوما تھا۔ اس کی اسکن میں باس میک اپ کی مہک تھی۔ مرتضیٰ نے یکدم آنکھیں کھولیں۔

"نسرین! تم بہت اچھی ہو۔۔۔ بہت اچھی۔۔۔ اباجی کو کہنا کہ انہوں نے مجھے زندگی کی ہر نعمت دی۔۔۔ تم سب سے اچھی نعمت ہو۔۔۔ ان سے کہنا۔۔۔ مجھے معاف کر دیں۔"

وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔ نسرین کا دل رکنے لگا۔ مرتضیٰ کے ساتھ کچھ غیر معمولی ہو رہا تھا۔

"اباجی۔۔۔ سے کہنا۔۔۔ مجھے۔۔۔ ضرور معاف۔۔۔ کر دیں۔۔۔ وہ مجھے معاف۔۔۔ کر دیں۔۔۔ گے۔۔۔ نا۔۔۔ تم۔۔۔ بھی۔۔۔ مجھے۔۔۔ معاف۔۔۔ کر دینا۔" اس کی آواز رک رہی تھی۔

"مرتضیٰ! آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا۔۔۔ آپ کو کیا محسوس ہو رہا ہے؟" نسرین اس کے چہرے کو بانے جانے لگی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"میں۔۔۔ ٹھیک ہوں۔۔۔ تم مجھے۔۔۔ سلا دو۔۔۔ مجھے بہت۔۔۔ اچھا۔۔۔ لگ رہا۔۔۔ ہے۔۔۔ لا۔۔۔ الا۔۔۔ اللہ۔۔۔ ہو۔۔۔ لا۔۔۔ الہ۔۔۔ اللہ۔۔۔ ہو۔۔۔ مجھے بہت نیند آ رہی ہے۔۔۔ میرا سر۔۔۔ دبا دو۔۔۔"

اس نے بہت پرسکون ہو کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ نسرین نے آہستگی سے اس کا سر اپنے زانو سے تکیے پر منتقل کیا اور باہر کی جانب بھاگی۔ اس نے سب سے پہلے ارتضیٰ کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔

"دفع ہو جاؤ۔۔۔ سب یہاں سے۔۔۔ مجھے آپ لوگوں کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ بند دروازے کے پیچھے سے چلا کر بولا تھا۔ نسرین پچھلے جانب بنے کمروں کی طرف بھاگی تھی۔ اکبر کا کمرہ اسی طرف تھا۔ اکبر کو لے کر جب وہ اپنے بیڈ روم میں آئی تھی

تو سب ختم ہو چکا تھا۔ مرتضیٰ ابدی نیند سو چکا تھا۔ اس کے چہرے پر بے حد سکون تھا۔ ایسا سکون جو بہت سالوں سے اس نے زندگی میں محسوس نہیں کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میرا دل چاہتا ہے' میں مر جاؤں یا تم مر جاؤ تاکہ ہم دوبارہ کبھی ایک دوسرے کی شکل نہ دیکھ سکیں۔"

کوئی اس کے کانوں میں بہت زور سے چلایا تھا' اتنی زور سے کہ وہ ہل کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ڈریسنگ روم کے کونے میں لگے زرد بلب کی روشنی میں اس کے سامنے ایک تیز رنگوں والا زنانہ لباس پڑا تھا۔ انتہائی تنگ والی قمیص جس پر جابجا شیشے لگے تھے۔ زلوز وز جس پر لمبے لمبے سلمنیں تھے اور ریں نما دوپٹہ۔ یہ تھا وہ لباس جو اسے پہننا تھا۔ قمیص کے ننھے شیشوں میں اسے اپنا عکس نظر آ رہا تھا۔ اسے پہلی بار اپنے خوبصورت چہرے سے بے انتہا نفرت محسوس ہوئی۔ وہ اس چہرے کے عشق میں مبتلا تھا۔ یہ عشق ایسے ہی ختم ہوا تھا جیسے ریت ہتھیلی میں سے پھسل جاتی ہے۔ اس کی آنکھ سے ایک آنسو گرا تھا۔ ہر آنکھ جب زچگی کے عمل سے گزر کر آنسو پیدا کرتی ہے تو تکلیف سہتی ہے اور جو آنکھ پہلی دفعہ زچگی کے عمل سے گزرے اس کی تکلیف حد سے زیادہ ہوتی ہے۔ ارتضیٰ بھٹی نے اپنی بائیں آنکھ میں بے پناہ درد محسوس کیا۔

اس کے دل میں پہلی بار یہ خواہش جاگی کہ وہ اپنے باپ کو ایک لمحے کے لیے زندہ سلامت اپنے سامنے دیکھ سکتا' اسے دیکھ سکتا اور اس کے لمس کو محسوس کر سکتا۔

طاہر ملک نے پیسے دینے کی جو شرط رکھی تھی' وہ اس کے لیے ناقابل قبول تھی لیکن مجبوری یہ تھی کہ وہ کہیں اور سے پیسے لا نہیں سکتا تھا۔ اسے سمجھ میں آ گیا تھا کہ "مجبوری" آخر کس چڑیا کا نام ہوتا ہے۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ جب مجبوری آپ کو گلے لگاتی ہے تو کیسا محسوس ہوتا ہے۔ آج اسے پہلی مرتبہ زندگی نے لڈو کا دانہ بنا کر کھیل کا آغاز کیا تھا اور وہ آغاز میں ہی ادھ موا ہوا جا رہا تھا۔ وہ اپنے باپ کے مرنے پر صرف روپے کا ہی انتظام کر پایا تھا اور یہی اس کے لیے سب سے زیادہ مشکل کام ثابت ہوا تھا۔ روپے اکبر کو دے کر وہ تھیٹر ہال میں چلا آیا تھا کیونکہ اسے ایسا ہی کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔

"تمہارا باپ "تایا کبری" کا رول کر رہا تھا۔۔۔ رول تو تمہارا بھی وہی ہو گا۔۔۔ مگر تم ذرا لیلا گزمت یاد کرو۔۔۔ میں تمہارا دکھ سمجھ سکتا ہوں۔۔۔ تم بس اسٹیج پر ادھر ادھر چھلانگیں مارتے پھرنا۔۔۔ پہلے دن یہی کافی ہے۔"

ڈائریکٹر نے طاہر ملک کی ہدایات کے مطابق اسے اس کا کردار سمجھایا تھا جبکہ وہ اس کی باتیں نہیں سن رہا تھا۔ وہ مسلسل گھڑی کی جانب دیکھتا رہا تھا۔

"سوا بارہ۔۔۔ اب بابا کو نہلا کر کفن پہنا چکے ہوں گے۔۔۔ مما اب رو نہیں رہی ہوں گی مگر ان کی سوجی ہوئی آنکھیں بابا پر جمی ہوں گی۔۔۔ بڑے اباجی (دادا) کو تو اطلاع ہی نہیں دی۔۔۔ جب میت سلانوالی پہنچے گی تو انہیں پتا چلے گا۔۔۔ وہ کتنا دکھی ہوں گے۔" وہ ذہن میں ان تمام مناظر کو لانے کی کوشش کر رہا تھا۔

حیرت انگیز بات یہ تھی کہ آج اسے تمام رشتے ان کے اصلی ناموں کے ساتھ یاد آ رہے تھے۔ حالانکہ وہ ہمیشہ ان رشتوں کو حقارت سے ہی مخاطب کرتا رہا تھا۔ اس کا غرور' اس کا تفاخر آج سب ختم ہو چکا تھا۔ اس کے کندھے جھکے ہوئے تھے اور چہرے پر مسکین سی بے چارگی تھی۔

"تم ہو بہو بھٹی صاحب کی کاپی ہو۔" طاہر ملک نے اسے دیکھتے ہی کہا تھا۔ قمیص کے شیشوں میں اس کا عکس اس کا تو نہیں تھا' وہ واقعی بھٹی صاحب کی کاپی تھا۔ زندگی کا کوئی ری پلے نہیں ہوتا لیکن انسان کا ری پلے اس کی اولاد کی صورت میں ہو سکتا ہے۔ غلام مرتضیٰ بھٹی کا ری پلے ارتضیٰ بھٹی جو ہمیشہ اپنے باپ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا رہا تھا۔ آج اس زرد روشنی والے ڈریسنگ روم میں واقعی آج اپنے باپ کی کاربن کاپی لگ رہا تھا۔

"چھوٹے بھٹی صاحب! جلدی کریں۔۔۔ ہماری باری بھی آنی ہے جناب۔۔۔ جلدی باہر آؤ۔"

کسی نے ڈریسنگ روم کا دروازہ کھٹکھٹا کر کہا تھا۔ وہ ذرا بھی نہیں چونکا تھا۔ اس نے رخ موڑ کر ڈریسنگ روم کے دروازے کی جانب دیکھا۔ ایک وقت آیا تھا کہ اس کے باپ نے بھی چونکنا چھوڑ دیا تھا۔

"اب بابا کو گاڑی میں لٹا رہے ہوں گے۔۔۔ مما ان کے ساتھ ہوں گی۔۔۔ مما ہمیشہ ان کے ساتھ رہتی تھیں۔ تایا مصطفیٰ اور ماموں عنایت اللہ بھی اسی گاڑی میں مما کے ساتھ بیٹھے ہوں گے۔ مما بار بار تابوت کے اوپر لگے گلاس کیس میں سے بابا کے چہرے کی جانب دیکھ رہی ہوں گی۔"

وہ تصور کی آنکھ سے سب دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس نے کبھی زندگی میں اپنے باپ کا ساتھ نہیں دیا تھا لیکن آج اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے باپ کے آخری سفر میں قبر تک اس کا ساتھ دے پاتا۔ "دروازہ ایک بار پھر زور سے بجایا گیا تھا۔ اس نے قمیص اٹھا کر ہاتھ میں پکڑلی۔ اسے وہ کپڑے پہننے ہی تھے۔ ہمت کر کے اس نے ان کپڑوں کو اپنے جسم پر سجانا شروع کیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے اب لگاتار آنسو گر رہے تھے۔ ایک کے بعد ایک اسے اپنے باپ کی باتیں یاد آرہی تھیں۔ وہ محبت' وہ شفقت' جو وہ اس پر لٹاتا تھا اور وہ بدتمیزی جو بدلے میں وہ اپنے باپ کے ساتھ کرتا تھا۔ بچپن سے لے کر اب تک وہ بوسے جو اس کے باپ نے اس کی پیشانی پر دیے تھے اور وہ جھنجلاہٹیں جو وہ اپنے باپ کو دیتا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے اپنے باپ کا چہرہ آگیا۔ اس کی جھنجلاہٹ' بدتمیزی اور کسی سخت جملے پر اس کی آنکھوں میں جو عجیب سی بے چارگی آجاتی تھی۔ ارتضٰی کو وہی بے چارگی یاد آگئی۔ وہ ڈریسنگ روم سے فوراً نکل آیا۔ وہ وہیں کھڑا رہتا تو شاید مر جاتا۔ وہ اس وقت اپنے آپ کو اتنا ہی محسوس کر رہا تھا کہ اس نے اپنے حلیے کی بھی پروا نہیں کی۔ قمیص جو بے حد تنگ تھی' اس کے کسرتی جسم کے ساتھ چپک کر وہ بے حد مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔ ٹراؤزر کے سلٹ میں سے اس کی پنڈلیاں نمایاں ہو رہی تھیں۔

"سو ہنو زپ تے بند کرلو۔"

کسی کی زنانہ آواز آئی تھی اور پھر ایک ہاتھ اس کے پشت پر دھیرے دھیرے چلنے لگا تھا جب تک زپ نہیں بند ہوئی تھی' وہ سانس روکے کھڑا رہا تھا۔ زپ بند ہونے کے ساتھ ہی ایک بے ہنگم قہقہہ ابھرا تھا۔

"اپنے باپ کے جیسا شرمیلا ہے۔" اس نے مڑ کر ان کی جانب نہیں دیکھا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھیں' بے حد عجیب و غریب تھیں۔ ڈریسنگ روم سے باہر نکلتے وقت وہ ان پر ایک نظر ڈال چکا تھا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ جب کل وہ انہی عورتوں کو اسٹیج پر رقص کرتے اور بیہودہ مذاق کرتے دیکھ رہا تھا' تب وہ اسے عجیب و غریب نہیں لگی تھیں۔ تب اسے انہیں دیکھنے میں بہت مزا آرہا تھا۔

"میک اپ کروالو چھوٹے بھٹی صاحب!" کسی جانب سے آواز آئی تھی۔ وہ فوراً اس کیبن کی جانب چلا گیا تھا۔ وہاں ایک عورت بیٹھی پہلے سے میک اپ کروا رہی تھی۔

"یہ بھٹی صاحب کا بیٹا ہے؟" اس نے میک اپ مین سے پوچھا تھا۔ اس کی مردانہ آواز سن کر ارتضٰی کو اندازہ ہوا کہ وہ "مرد" ہے۔

"آپ ادھر بیٹھ جاؤ۔" ایک شخص نے اسے کرسی دی۔ وہ جھجکتے ہوئے اس پر بیٹھ گیا تھا۔ سامنے لگے شیشے میں اب اسے اپنا مکمل عکس نظر آرہا تھا۔ اس کی دونوں جانب دو ڈوگ میک اپ کروا رہے تھے۔ ان میں سے ایک کو وہ عورت سمجھ رہا تھا جبکہ وہ مرد تھا جبکہ دوسری جانب ایک عورت تھی جس نے ابھی تک ایک جملہ بھی نہیں بولا تھا جس سے یہ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ واقعی عورت ہے یا مرد۔

میک اپ مین نے اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیا تھا پھر مختلف چیزوں کو اس کے چہرے پر پھیلانا شروع کر دیا تھا۔ وہ لڑکا کافی تیزی سے ہاتھ چلا رہا تھا۔ اسی دوران کمرے میں بیٹھے عورت نما مرد نے اپنے ڈائیلاگز دہرانے شروع کر دیے تھے۔ ان ڈائیلاگز کو سن کر ارتضٰی شرم سے پانی پانی ہوا جا رہا تھا۔

جب وہ کل ہال میں بیٹھا یہ سن رہا تھا' تب اسے یہ سب ایڈونچر لگ رہا تھا اور اب جب اسے سب کے سامنے یہ پرفارم کرنا تھا تو اسے شرم آرہی تھی۔

"اس کو پوچھو' یہ وہاں کیا کر رہا تھا؟" اس کے کانوں میں اپنے باپ کا کہا گیا جملہ نجانے کہاں سے بنا دستک دیے چلا آیا اور دل ایک بار پھر پاتال میں گرنے لگا۔

درد کا ذائقہ وہی ہوتا ہے جو انسان محسوس کرے۔ اسے اس درد کا ذائقہ مانوس لگا۔ یہ ذائقہ اس کا باپ چکھ چکا تھا۔ یہ درد اس کے باپ کے حصے میں اس کی وجہ سے آیا تھا۔

"تمہیں شرم آنی چاہیے یہ سب کرتے ہوئے۔۔۔ تم ایک نفسیاتی کیس ہو۔۔۔ تمہارا مسئلہ کیا ہے آخر۔۔۔ کر کیوں رہے ہو تم یہ سب۔۔۔ صرف اس لیے کہ خود کو تسکین پہنچا سکو۔ مجھے مت بتاؤ کہ تم نے یہ سب پیسے کے لیے کیا۔۔۔ کوئی پیسے کے لیے اس غلاظت میں نہیں کود سکتا۔۔۔ کوئی پیسے کے لیے یہ گھٹیا کام نہیں کر سکتا۔ کوئی پیسے کے لیے۔۔۔ کوئی پیسے کے لیے۔۔۔ کوئی پیسے کے لیے۔۔۔"

اس کے کان مسلسل اپنے لیے گئے جملے سن رہے تھے۔

اس کا سر درد سے پھٹ رہا تھا جبکہ میک اپ مین اسے پرسکون رہنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ میک اپ مکمل کر کے

اسے آئینے کے بالکل سامنے کر دیا گیا تھا۔

وہ ارتضٰی بھٹی نہیں بلکہ واقعی "آپا صغریٰ" نامی ہیجڑا لگ رہا تھا۔ اس نے خود اپنا ایسا مضحکہ خیز روپ کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن وہ ہنس نہیں رہا تھا۔ ایسا لازمی نہیں کہ مضحکہ خیزی ہمیشہ ہنسانے کا باعث ہو۔ وہ آئینے کے سامنے بالکل ساکت بیٹھا تھا۔ اب اس کے تصور میں کوئی فلم نہیں چل رہی تھی۔ اس کے ذہن میں باپ کی جو تصویر آرہی تھی وہ "غلام مرتضٰی بھٹی" کی نہیں تھی بلکہ "آپا کبریٰ" کی تھی۔

"بارہ بجے ڈرامہ شروع ہوگا۔۔۔۔ پہلے سین سے ہی تمہاری انٹری ہے۔۔۔۔ بھٹی صاحب "کبریٰ" کے نام سے مشہور تھے اور تم دیکھنا تمہیں "صغریٰ" کے رول میں بہت پذیرائی ملے گی۔ تمہیں کچھ نہیں کرنا' بس پندرہ منٹ بعد ایک ٹھمکا شمکا لگا لینا۔ اس چیز سے پبلک بہت خوش ہوتی ہے۔"

کوئی بہت قریب آکر اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ تمام اداکار اب ایک جگہ اکٹھے ہو رہے تھے۔

"یوم حساب کبھی بھی ہو سکتا ہے۔" اس کے ذہن میں "نزی" فقرہ گونجا تھا۔ ڈرامہ شروع ہونے میں پانچ منٹ ہی باقی تھے۔

☼ ☼ ☼

ڈرامہ شروع ہوتے ہی پورا ہال تالیوں کی آواز سے گونج اٹھا تھا۔

پچھلی نشستوں کے عین اوپر نصب بڑے بڑے بلب گل ہونا شروع ہوئے تھے۔ روشنی بہت سرعت سے سیاہ لبادہ اوڑھ کر تاریکی کا روپ دھارنے لگی۔ لمحہ بھر میں تمام ہال اندھیرے کی موسلا دھار پھوار سے بھیگ چکا تھا۔ اسٹیج پر ٹنگا بھاری سرخ پردہ سرکنے لگا۔ تالیوں کی گونج دھیرے دھیرے دم توڑنے لگی۔ لوگ ہال میں موجود کرسیوں پر اٹھے پردے کے ہٹ جانے کے منتظر تھے۔ سارا ہال انسانی سروں سے بھرا نظر آرہا تھا اور ایسے میں کسی نے اپنی بھوری آنکھوں سے ان انسانی سروں پر نظر ڈالی۔ کل وہ بھی انہی کے درمیان تھا' آج وہ ان کے سامنے آکھڑا تھا۔

"شرمندگی' ملال' پشیمانی' ذلت' گندگی' مجبوری' تاسف' روپے' بھوک' نفس' پچھتاوا' دکھ' مایوسی اور توبہ۔"

صغریٰ آپا کے ذہن میں لفظ گونج رہے تھے' احساس نہیں۔ احساس مرچکا تھا۔

بھوری آنکھوں والا وہ لڑکا جس نے لڑکیوں کے جیسے کپڑے پہنے ہوئے تھے' جس کے چہرے پر سرخ رنگ کا میک اپ تھا۔ یکدم اسٹیج پر گر گیا۔ ایسے جیسے سجدے میں گرتے ہیں۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا تھا۔

"کلمہ شہادت' کلمہ شہادت' کلمہ شہادت' کلمہ شہادت۔"

وہ روتے روتے چلا رہا تھا۔ سارے ہال میں تالیاں بجنے لگیں اور سیٹیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ آپا صغریٰ کی پہلی انٹری لاجواب تھی۔

اس طرح یہ کہانی وہاں ختم ہوئی' جہاں ڈرامہ شروع ہوا تھا۔